اِسلام

امن و آشتی کا مذہب

مصنف: خواجہ غلام السیدین

مترجم: ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

Institute of Islamic Culture
ادارہ ثقافت اسلامیہ
Lahore - Pakistan

297.01
غ 543 ا
124488

Marfat.com

Marfat.com

221682
DATA ENTERED

اسلام:

امن وآشتی کا مذہب

مصنف: خواجہ غلام السیدین

مترجم: ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

۲-کلب روڈ، لاہور

فون:042-36363127,36305920،ای میل:iic-lhr@hotmail.com

Marfat.com

۰۹۹۲.۰۱
۱۰۴۳ غ
۱۲۴۴۸۸
۲/
غلام السیدین خواجہ

عنوان: اسلام: امن اور آشتی کا مذہب

مصنف: خواجہ غلام السیدین

مترجم: ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

اشاعتِ اول: 2014ء

ناشر: قاضی جاوید
ناظم، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ

مطبع: مکتبہ جدید پریس، لاہور

قیمت: 80 روپے

یہ کتاب اکادمی ادبیات پاکستان اور حکومتِ پنجاب کے محکمہ اطلاعات وثقافت کے تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

Marfat.com

خواجہ غلام السیدین

ترجمہ: ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

امن و آشتی کا مذہب، اسلام
(I)

اسلام کا پیغام:

مجھے عالمِ دین ہونے کا دعویٰ نہیں ہے، اس لیے عین ممکن ہے کہ میں اسلام کے پیغام کی ترجمانی کرتے ہوئے بعض اُمور میں عقیدے کی رسمی اور روایتی ڈگر سے ہٹ جاؤں۔ کہیں تو یہ فرق محض کچھ باتوں کو زیادہ اہمیت دینے نہ دینے کا ہوسکتا ہے، کہیں کہیں مستقل بالذات بھی ہوگا۔ مجھے تعلیماتِ اسلامی کے بعض پہلوؤں کی ایسی تاویل دیکھنے کا اتفاق بھی ہوتا ہے جنھیں میں ذاتی طور پر قطعاً ناقابلِ قبول سمجھتا ہوں۔ میں یہ بھی نہیں مانتا کہ چونکہ ایک رائے آج سے ہزار پانسو برس پہلے ظاہر کی جاچکی ہے، لہٰذا محض اپنی قدامت کی بناء پر آج بھی وہ قابلِ احترام ہے۔ مثلاً میرا عقیدہ ہے کہ بہت سے دنیوی امور میں اسلام نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ اس نظریے کے برخلاف بعض فقہاء نے سیاسی اور سماجی معاملات میں غیر مسلم (ذمی) رعایا کے ساتھ مسلمانوں کے سلوک کے بارے میں بعض ایسی شرائط عاید کردی ہیں جو انسانی مساوات کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہیں۔ نہ صرف قرآن کے مجموعی اندازِ نظر سے ان کی تائید نہیں ہوتی، بلکہ یہ انسان دوستی کی روح کے بھی منافی ہیں۔ جب کوئی شخص ایسی کسی تفسیر کے پایۂ استناد کو جانچنا چاہے تو اسے محض یہی نہیں دیکھنا چاہیے کہ جن لوگوں کے ذریعے یہ روایت منتقل ہوئی ہے وہ کہاں تک سچے اور قابلِ اعتبار تھے جیسا کہ اب تک ہمارے علماء کرتے آئے ہیں۔ بلکہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ وہ

Marfat.com

روایت اس مذہب کے نظریات کے عام سماجی اور اخلاقی ڈھانچے سے مطابقت بھی رکھتی ہے یا نہیں۔ مثلاً قرآن کا بالکل واضح موقف ہے کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ وہ سلوک کیا جائے جو رواداری، فراخ دلی اور اخوتِ انسانی کے اصول پر مبنی ہو۔ اب اس کے بعد اگر کوئی ایسی حدیث یا اس کی کوئی تاویل ملتی بھی ہے جو مذکورہ بالا تعلیم سے لفظاً و معناً مختلف ہو تو یہ نتیجہ نکالنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ زمانۂ مابعد میں حکمران طبقے کے ان اعمال کا جواز پیدا کرنے کے لیے گڑھی گئی ہوگی جنھیں اور کسی طرح جائز قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

ایسی موضوع احادیث اور قرآنی آیات کی تفسیر بالرائے کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جنھیں علمائے سوء نے حاکمانِ وقت کو خوش کرنے کے لیے گڑھ لیا تھا۔ ایسے حالات میں مغز اور پوست میں فرق کرنا اُن افراد کی ذمہ داری ہو جاتی ہے جو باشعور ہیں اور صداقت کا احساس رکھتے ہیں۔ اور یہ ایسا حق ہے جو کچھ قیود کے ساتھ اسلام نے ہر شخص کو دیا ہے۔ اسی کو ''حقِ اجتہاد'' کہتے ہیں۔ اسلام نے انسانی زندگی کے روحانی معاملات میں بھی اور مذہب سے علاقہ نہ رکھنے والے مسائل میں بھی، عقل کو ایک اہم مقام عطا کیا ہے۔ قرآن میں فکر اور عقل و مشاہدہ کی ضرورت پر بار بار زور دیا گیا ہے۔

مذاہب کی عموماً غلط تاویل ہوتی ہے تاکہ اس عقیدے کو شہ ملتی رہے کہ انسان کی قسمت تو خدا نے پہلے سے بنا دی ہے اور خدا جس حال میں اُسے رکھنا چاہے بندے کو اس سے دم مارنے کی مجال نہیں ہے۔ انسان کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ایسے عقائد کے خلاف بار بار بغاوت کرتا رہا ہے جن کی تبلیغ مختلف ذرائع سے ہوتی رہی ہے اور اس طرح انسان اپنے آزادیٔ فکر کے ورثے میں آہستہ آہستہ اضافہ کرتا رہا ہے۔ مذہب اور اخلاقیات کے میدان میں انسان نے جو پیش رفت کی ہے اُس میں نہ صرف آزادیٔ فکر کا یہ سرمایہ اس کی پشت پر رہا ہے بلکہ یہ کرۂ ارض پر انسانی زندگی کے رنگارنگ پہلوؤں میں سب سے زیادہ قیمتی اور قابلِ فخر متاع ہے۔

ہر مذہب میں یہ رجحان عام ہے کہ روایت پرست لوگ لفظ کو معنی پر فوقیت دیتے ہیں اور رسوم و عقائد کو بنیادی اور حیات افروز اصولوں سے بالاتر رکھتے ہیں۔ لفظی تاویلات سے ذرا

Marfat.com

بھی بننا نہیں چاہتے اور اس کی شرح میں بال کی کھال نکالتے رہتے ہیں۔ یہ کسی حد تک مذہبی رہنماؤں یعنی مولویوں، پنڈتوں اور پادریوں کی رجعت پرستی کے باعث ہوسکتا ہے لیکن اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ لوگ نئی تحریکوں سے باخبر نہیں رہتے، فکر و خیال کے جدید تقاضوں اور انسانیت کے تازہ تر مسائل و مقتضیات سے غافل رہتے ہیں اور ان میں سے اکثر کی یہ کوشش بھی ہوتی ہے کہ عافیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور نئے افکار سے جو خطرات پیدا ہو سکتے ہیں، اُن سے محفوظ رہیں۔

یہی سبب ہے کہ ہر مذہب میں ان لوگوں کی تعداد مختصر ہے جو اپنے مذہب کے دائرے میں بند بھی رہے ہوں اور اُنہوں نے حقِ اجتہاد کا استعمال کر کے نئے افکار بھی پیدا کیے ہوں۔ اس پر دوسرے مذہب والوں کی طرف سے تنقیدی تبصرے بھی ہوئے ہیں جو کبھی کبھی نامناسب حد تک سخت تھے اور یہ عموماً ناراضگی یا مناظرے بازی کی پیداوار تھے۔ روایت پرست علماء کے سامنے دوسرا مقصد اپنے مفادات کا تحفظ اور عوام میں اپنے اثر و نفوذ کو باقی رکھنا تھا۔ اگر کسی مذہب کے پیرو یہ سمجھنے لگیں کہ انہیں مذہبی امور میں آزادیٔ فکر کا حق بھی حاصل ہے اور وہ ان مسائل کو اپنے طور پر سمجھنے میں اپنا دماغ کھپانے لگیں تو مذہب کی تفسیر و تعبیر پر ان روایت پرستوں کی اجارہ داری معرضِ خطر میں پڑ جاتی ہے۔ اس ملک کے بعض دور افتادہ دیہی علاقوں میں تو آج بھی یہ ہوتا ہے کہ ملاجی سال چھ مہینے میں ایک بار وہاں آتے ہیں اور چھری پر کلمہ دم کر کے اپنا نذرانہ لے جاتے ہیں۔ کلمہ پڑھنے یا سیکھنے کی کوشش کرنے کی بجائے گاؤں والے اُسی 'پڑھی ہوئی' چھری سے ذبیحہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ انتہائی درجے کی مثال ہے مگر اس سے صورتِ حال کا اچھی طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ جب کسی مذہب میں اس طرح کے معاملات ہونے لگتے ہیں تو اس کا وہ توانا حصہ جس میں زندگی بخش عناصر اور حرکی قوت ہوتی ہے، گھٹ کر چھوٹی چھوٹی غیر اہم اور بندھی ٹکی باتوں تک محدود ہو جاتا ہے۔ یہ تمام مذاہب کے لیے ایک زبردست انتباہ ہے کہ وہ خطرے کے نشان تک پہنچ گئے ہیں۔

یہ بات بہرحال مشتبہ ہوسکتی ہے کہ میں اسلام کے پیغام کی بطور خود شرح کرنے کا

Marfat.com

اہل ہوں یا نہیں۔ مگر میں سختی سے اس بات کا حامی ہوں کہ ہر سنجیدہ دیانت دار اور ذہین انسان کو ایسا کرنے کا حق ہے۔ اس طرح کی نئی تشریح و تعبیر ہر زمانے میں مختلف وجوہ سے ضروری بھی ہو جاتی ہے۔ جدید دُنیا پر کم سے کم پچھلی دو صدیوں میں ایسے نئے نئے دباؤ پڑے ہیں اور اتنی سماجی، ذہنی اور تکنیکی تحریکیں پیدا ہوئی ہیں جنھوں نے انسانی زندگی کے پورے ڈھرّے ہی کو بدل دیا ہے۔ اب مذہب کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ عہدِ حاضر میں اپنے کردار اور دائرۂ عمل کا دوبارہ جائزہ لے اور اس کی نئی تعبیریں پیش کرے۔ اس کے لیے ہم آہنگی اور تطبیق کا رویہ اختیار کرنا ضروری ہے، جو نئے دَور کی ثنویتوں کو بھی میں رکھے جو بڑی تیزی سے پیدا ہو رہی ہیں اور آج کے تضادات میں ایک واضح موقف بھی اپنا سکے۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ اب مذہب کو بسم اللہ کے گنبد میں بند نہیں ہونا چاہیے۔ یہ عذر نامناسب ہے کہ ان کا ان ارضی اور مادی اُمور سے کچھ سروکار نہیں، اس کا مطمحِ نظر تو صرف آخرت ہے۔ کوئی بھی مذہب ہو، اگر وہ اس 'دوسری دُنیا' والے نظریے کو اختیار کرتا ہے تو یہ اسکی بنیادی صلاحیتوں کا غلط بلکہ شاید جھوٹا استعمال ہوگا اور اسلام تو ظاہر ہے کہ خاص طور پر اس لیے آیا تھا کہ روحانی اور مادی دُنیا کے درمیان دوئی کو مٹا دے۔ وہ تو ایک سچے مسلمان کی نشانی یہ بتاتا ہے کہ وہ دُنیا اور آخرت کی بھلائیوں (حسنات) کی تمنا اور ان کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کوئی طمع نہیں ہے، جیسا کہ ایک ہی وقت میں سب چیزوں کے طلب کرنے کو کہا جاتا ہے، بلکہ اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہے کہ دونوں عالم درحقیقت ایک ہی ہیں اور کوئی شخص بھی 'روحانی' ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اس دُنیا کی زندگی کو بہتر بنانے میں ناکام رہا ہے۔ اس کے برعکس اس نے اپنی روحانی زندگی کو ایک ضابطے میں نہیں ڈھالا ہے تو وہ اس دُنیا کی زندگی کو بھی نہیں سنوار سکتا اور جو اس دُنیا میں کھو گیا وہ تو پھر کہیں کا نہیں رہا۔ یہی بات اقبال نے اپنے مخصوص نکتہ سنجی کے انداز میں یوں کہی ہے:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

Marfat.com

فارسی کے عظیم شاعر مولانا رومؒ نے اسی مضمون کو نئے انداز میں یوں کہا ہے:

ہر کہ بر افلاک رفتارش بود
بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود

قرآن کی ایک آیت بھی یہی کہتی ہے:

ومن كان في هذه أعمى فهو في الآخرة أعمى و أضل سبيلاً. (بنی اسرائیل: ۱۷-۷۲)

اور جو اِس دُنیا میں اندھا بن کر رہا، وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا بلکہ (راستہ پانے مین) اندھے سے بھی زیادہ ناکام۔

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ انسان کے اچھے یا برے اعمال کے نتائج اس کی موت کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے دُنیا کو 'مزرعۂ آخرت' بھی کہا گیا ہے یعنی جو کچھ ہم یہاں بوئیں گے وہی آخرت میں کاٹیں گے۔

آج کے انسان پر مذہب کی گرفت، خواہ وہ کوئی بھی مذہب ہو، کیوں ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے؟ اس کے اسباب میں سے ایک قوی سبب یہ ہے کہ آج زندگی پر جو دشواری اور بے یقینی کا ماحول مسلط ہے اس میں مذہب کوئی مؤثر رہنمائی دینے سے قاصر ہے۔ آج کا انسان افلاس، جہالت اور بیماریوں کا شکار ہے، نئی طرح کے توہمات اور تعصبات کا مارا ہوا ہے، تشکیک میں گرفتار اور استحصال کا ہدف ہے، نسلی، قومی، نظریاتی اور علاقائی عصبیتوں میں الجھا ہوا ہے۔ ہمہ وقت جنگ، نسل کشی اور کیمیائی و جراثیمی اسلحہ کے استعمال سے تباہی کا خطرہ اس کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ ایٹمی تباہ کاری کا بھوت اسے ڈرا رہا ہے۔ اس کی اچھی اور بری روایتی قدریں مٹا دی گئی ہیں، مگر ان کی جگہ نئی اور حیات بخش قدروں نے پر نہیں کی ہے۔ اس طرح وہ بہت سی منفی طاقتوں کے بیچ میں پھنسا ہوا ہے جنہیں اگر بروقت نہ روکا گیا تو اس بات کا امکان ہے کہ قومی سطح پر خودکشی نہیں تو کم از کم اس کی سماجی زندگی میں شدید رخنے ضرور پیدا ہو جائیں گے۔

مگر ان بے کسی کے حالات میں مذہب کا ساتھ چھوڑ جانا ہی یقیناً واحد سبب اس کی

Marfat.com

گرفت کے کمزور ہو جانے کا نہیں ہے۔ بہت سے ایسے مفکر بھی ہیں جنھوں نے پوری ایمانداری سے محسوس کیا ہے کہ کسی مخصوص مذہب سے ان کی وابستگی واقعی ایک دشوار کام ہے، اگرچہ وہ بھی زندگی میں ایسی بہت سی قدروں کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہیں جنھیں میں ذاتی طور پر 'مذہبی اقدار' ہی کہوں گا۔ میں سمجھتا ہوں خدا میں اتنا رحم اور مکارم کا احساس ضرور ہے کہ وہ انہیں اپنی آغوشِ رحمت میں لے لے گا جیسا کہ کسی نے کہا ہے کہ 'خدا میں اتنی بردباری ہے کہ وہ پروفیسر آئر (Ayer) اور مالکم مگرج (Malcolm Muggeridge) کے اس قول کو بھی برداشت کر سکتا ہے کہ وہ کوئی وجود ہی نہیں رکھتا' مگر کوئی شخص نہ یہ دعویٰ کر سکتا ہے نہ اُسے فرض کر کے آگے بڑھ سکتا ہے کہ 'انسان کا وجود نہیں ہے۔' ان سے بھی بڑی تعداد اُن لوگوں کی ہے جنھوں نے مذہب کو اتنی آسانی سے ردّ کر دیا ہے جتنی آسانی سے اُسے بہتوں نے قبول کر رکھا ہے۔ یعنی بغیر غور و فکر کی زحمت اُٹھائے ہوئے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تقویم پارینہ ہے، جدیدیت کے خلاف ہے، فیشن سے میل نہیں کھاتا وغیرہ۔ اس گروہ کا معاملہ اور بھی بدتر ہے کیونکہ ان میں قوتِ فکر اور دیانت دونوں کا فقدان معلوم ہوتا ہے۔

اس شدید بحران کے عالم میں کوئی مذہب یا مذاہب انسان کو کیا دے سکتے ہیں؟ کچھ مستثنیٰ افراد کو چھوڑ کر، جو اُمید گاہ کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے گاندھی، شوئیٹزر، مولانا آزاد وغیرہ، مذہب کے حامیوں میں نمایاں طور پر اس بات کا احساس بھی نہیں پایا جاتا کہ اصولِ اخلاق یا نیکیوں کی محض رسمی اور غیر فکر انگیز تبلیغ حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکے گی۔ عبادات کی کچھ مقررہ ظاہری رسموں کو ادا کر لینا، یا چند ثواب کے کام کر لینا کسی ایسے انسان کے لیے تسکینِ قلب کا موجب ہو سکتا ہے جس کے پاس مذہب اور زندگی کے امکانات کی وسعتوں کا بہت محدود تصور ہو۔ مثلاً اس سے کوئی ایسا دُنیادار شخص مطمئن ہو سکتا ہے جو زندگی کا بڑا حصہ دولت بٹورنے میں گنواتا ہو، یا حصولِ جاہ کے لیے کوشاں رہتا ہو یا لغو اور سستی لذتوں کے پیچھے بھاگتا رہتا ہو، مگر کبھی کبھی رسمی عبادت گزاری بھی کر لیتا ہو۔ مذہب کی سچی دعوت تو بہت پر معنی اور جچی تلی ہے۔ اس کا مطلب زندگی کو اس کے ان گنت شعبوں کے ساتھ اس طرح بسر کرنا ہے

Marfat.com

جیسے انسان ہمہ وقت اپنے خالق کے حضور میں ہے اور اپنی خودی کی عظیم اور ناقابلِ قدر صلاحیتوں کو قوت سے فعل میں لانے کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہا ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے:

ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراک.

(تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو، گویا تم اسے دیکھ رہے ہو،
اور اگر یہ نہ ہو سکے تو گویا وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔)

اس طرح وسیع ترین مفہوم میں ایک مومن کی ساری زندگی عبادت بن جاتی ہے۔
درحقیقت مذہب کے دو قطعی مختلف تصور ہیں جنہیں اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں ایک چھوٹی سی نظم میں بیان کر دیا ہے۔ یا تو یہ کائنات کی بیکراں وسعتوں میں خدا کی حمد و ثنا کرنا ہے اور اس کی رضا کو پورا کرنے کی جدوجہد ہے یا یہ زمین کی آغوش میں عاجزی کے ساتھ سجدہ ریز ہونا اور خدا سے بے سعی و جدوجہد اپنا مدعا طلب کرنا ہے۔ پہلے تصور کو وہ 'مرد خدا مست و خود آگاہ' کا مذہب کہتا ہے اور دوسرے کو 'دین ملا' یا نباتات و جمادات کے مذہب سے تعبیر کرتا ہے۔ جب میں مذہب کی بات کرتا ہوں تو ظاہر ہے کہ میرا مقصود اس کے دوسرے مفہوم سے نہیں ہوتا۔ یہ اگر اس چیلنج کا سامنا حوصلے اور ضبط کے ساتھ نہیں کرے گا تو زمانہ اسے روند کر آگے نکل جائے گا اور اگر سب لوگ نہیں تو کم سے کم نوجوان مرد اور عورتیں دوسرے زیادہ طاقت ور دھاروں میں بہہ جائیں گے۔

یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوتی ہے کہ اگرچہ اس وقت انسانیت کو ایسے عظیم بحران کا سامنا ہے جس کی نظیر ماضی میں نہیں ملتی، مگر مذاہب آج بھی اپنے حقیر نظریاتی اختلافات میں الجھے ہوئے ہیں اور ان کی مناظرہ بازی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ دراصل ان لوگوں کو زندگی میں مذہب کے صحیح مقام اور منصب کا اندازہ نہیں ہے۔ ہر شخص خصوصاً ہر ذہین مسلمان کو اس بات سے گہرا قلق ہونا چاہیے کہ اس کے مذہب کے ظاہر و باطن کا تضاد بڑھتا جا رہا ہے۔ مذہب کے لیے کہا گیا ہے کہ 'انسان کی زندگی پر اس کی رضا و رغبت سے خدا کی حکمرانی' کا سب سے بڑا

Marfat.com

وسیلہ ہے' اور یہ تعریف بڑی حد تک اسلام پر صادق آتی ہے، جہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے، جو خود بھی ایک مومن کی سچی مثال ہیں، یہ کہلوایا گیا ہے:

قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین. (۶:۱۶۲)

(اے نبیؐ! کہہ دیجیے کہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب کچھ خدا کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالنہار ہے۔)

اگر ایک مسلمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے، اس دُنیا میں بھی اور آخرت کے لیے بھی اور وہ سچے دل سے اپنے ایک خدا پر یقین رکھتا ہے جو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، اور میرا ایمان ہے کہ وہ ہے، تو اس کے لیے سچے راستے سے بھٹک جانے کا کوئی عذر ہونا نہیں چاہیے۔ اور ضروری نہیں ہے کہ یہ گمراہی بالقصد ہو، یا صراطِ مستقیم سے انحراف و انکار کا نتیجہ ہو۔ یہ اہم باتوں سے بے اعتنائی اور بے حسی یا غیر اہم باتوں میں غیر معمولی انہماک کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے۔ (مجھے ذاتی طور پر ان لوگوں کی بے اعتنائی کا ایک سبق آموز تجربہ ہوا، جو بظاہر دین کا درد رکھتے تھے۔ چند سال ہوئے ٹوکیو (جاپان) میں مذہب اور امن پر عالمی کانفرنس کے انعقاد سے ذرا پہلے میں نے مسلمانوں کے مذہبی اداروں کو ایک گشتی مراسلہ بھیجا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ایک ایسی کانفرنس چند ماہ کے بعد منعقد کرنے کا خیال ہے جس میں تمام مذاہب کے نمائندے اکٹھے ہوں گے اور باہم سر جوڑ کر مشورہ کریں گے کہ وہ قیامِ امن کے مقصد میں کیا مدد دے سکتے ہیں۔ میں نے ان حضرات سے پوچھا تھا کہ اس تجویز کے بارے میں ان کا ردِ عمل کیا ہے؟ کیا یہ تجویز انہیں مذہبی نقطۂ نظر سے معقول معلوم ہوتی ہے؟ اور آیا وہ اسے اخلاقی حمایت دینے پر آمادہ ہیں؟ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جتنے اداروں کو سوالنامہ بھیجا گیا تھا ان میں سے صرف ایک نے جواب دینے کی زحمت گوارا کی۔ یہ اتفاق سے ایسا جواب تھا جس میں تجویز کی تائید کی گئی تھی۔ مجھے بہر حال یہ شبہ ہے کہ جس ادارے نے

Marfat.com

میرے سوالنامے کا جزوی جواب دیا اُس کا سربراہ برسوں پہلے میرا شاگرد رہ چکا تھا۔ میں یہ تو نہیں سمجھتا کہ دوسرے اداروں کے جواب نہ دینے کا سبب یہ تھا کہ وہ امن کے حامی نہیں بلکہ وہ ان باتوں کو ذاتی تشویش کے مسئلوں میں سے نہیں سمجھتے اور یہ باتیں اُن کے محدود مفادات کے دائرے میں نہیں آتیں۔

نیکی کے فروغ میں بااثر لوگوں کی بے اعتنائی اور بے تعلقی برتنے سے دُنیا کو جتنا نقصان ہوا ہے اتنا اشرار کی شرانگیزیوں سے بھی نہیں ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مذہب کی حیثیت سے معاشرتی مسائل کا سامنا کرنے اور حوادث سے پریشان محسوس کرنے میں آج اسلام کی بہ نسبت عیسائیت (بالفاظِ دیگر مسلمانوں کے مقابلے میں عیسائی) کہیں آگے ہے۔ اسلام ہی نے سب سے پہلے کھلے الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ ہر انسان کو نیک کام میں تعاون کرنا چاہیے اور 'اثم وعدوان' سے کوئی تعلق نہ رکھنا چاہیے۔ اگر مذہب اس خوابِ خرگوش سے بیدار نہیں ہوتا، خاص طور پر اسلام جو فی الوقت ہمارا موضوعِ سخن ہے، تو وہ ایک حرکی قوت اور حیات افزاء طاقت بن کر نہیں رہ سکتا جیسا کہ ماضی میں رہا ہے، یا یہ خوش گمانی کی جاسکتی ہے کہ مستقبل میں ایسا بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

جب میں آج کی اصطلاحوں میں مذہبی تعلیمات کی تفسیر کرنے کی بات کرتا ہوں تو میرا یہ مدعا نہیں ہوتا کہ جدید سائنس یا ٹیکنالوجی یا فلسفہ و اقتصادیات یا دوسرے شعبہ ہائے علوم اپنے مخصوص میدانوں میں جن باتوں کو صحیح سمجھتے ہیں انہیں بجنسہٖ مذہب کو بھی قبول کر لینا چاہیے۔ دوسرے مذاہب کی طرح اسلام کے بعض وکیلوں نے بھی اکثر یہ نظریہ اپنایا ہے، مثلاً ہندوستان میں سرسیّد خاں نے۔ مگر اس میں کچھ کھلے ہوئے خطرے بھی ہیں۔ ایک زمانے میں جغرافیہ داں یقین رکھتے تھے کہ زمین چپٹی ہے۔ آج ان کا عقیدہ ہے کہ زمین گول ہے۔ جدید سائنس اس بات کی سختی سے تردید کرتی ہے کہ یہ کائنات چھ دن میں پیدا ہوئی ہے، اُس کا عقیدہ ہے کہ آفرینش کا عمل اربوں سال تک جاری رہا ہے اور ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی رو سے انسان کا مورثِ اعلیٰ بندر ہے۔ اگر علمائے متقدمین نے یہ سمجھا ہے کہ ابتدائی نظریات مذہب کے

Marfat.com

نظریات بھی ہیں تو اب اپنی ذہانت کی قوت سے یہ ثابت کرنا علمائے جدید کا کام ہے کہ صحفِ سماوی کی زمین کو فی الواقع گول ہی بتایا گیا ہے اور کائنات کی تخلیق کا عمل ایک طویل زمانے تک جاری رہا ہے اور بقائے اصلح کا اصول ہی ارتقا کے پیچھے کارفرما رہا ہے۔ ہمیں یہ حقیقت سمجھ لینی چاہیے کہ صحفِ سماوی سائنس کی کتابیں نہیں ہیں جو ان مسائل سے بحث کریں۔ اگر یہ سائنس کی کتابیں ہوتیں تو ہر بار سائنس کے نئے انکشافات اور علوم کی سرحدوں میں نئی توسیع کے ساتھ ہی ان پر بھی نظر ثانی کرنے کی ضرورت پیش آیا کرتی ہے جو قطعاً ناقابلِ عمل صورت ہے۔

اگر واقعی ان صحف میں ایسے سوالات کا حتمی جواب موجود ہوتا تو اُنہوں نے یا تو سائنس کی تحقیقات اور علوم کی ترقی کا گلا گھونٹ دیا ہوتا یا ان کی شہرت کو بٹا لگا دیا ہوتا۔ اسی وجہ سے یہ عیسائی کلیسا کی غلطی تھی کہ اس کے گیورڈنو برنو (Giordano Bruno) کو بدعقیدہ قرار دے کر اس کا حقہ پانی بند کر دیا اور اسے زندہ جلوا دیا، محض اس قصور پر کہ اور باتوں کے علاوہ وہ یہ عقیدہ بھی رکھتا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور خود محور کائنات نہیں ہے۔

صحفِ سماوی خواہ وہ اسلامی ہوں یا دوسرے مذاہب کے ہوں بنیادی طور پر الہامی کتابیں ہیں جن کا مقصد مردوں اور عورتوں کو انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی نیک زندگی کی دعوت دینا ہے تاکہ وہ ان اخلاقی اور معاشرتی قدروں کو پروان چڑھائیں جو اس مقصد کی تکمیل کے لیے اہمیت رکھتی ہیں اور انہیں ایسے کام کرنے کی تشویش اور توانائی مل سکے جو نمایاں طور پر اور صحیح ترین معنوں میں 'انسانیت' کے کام ہیں، جو انسان کو اللہ سے قریب لانے والے ہیں، جن میں انسان کے باہمی رشتوں کی تقدیس کا احساس ہو اور جو تاحدِ امکان خداوندی صفات اور عظمت کے علمبردار ہوں۔ اسی کو ایک مشہور آیت میں **تخلقو باخلاق الله** کہا گیا ہے۔ یعنی اپنے اخلاق میں خدا کی صفات کا جلوہ پیدا کرو۔

سائنس اور مذہب اصل میں حقیقت کو پانے کے لیے دو الگ الگ راستے ہیں۔ دو جداگانہ طریقے جن سے حقیقت کے مختلف چہروں کی جھلک نظر آتی ہے اور دونوں ہی اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ ایک شخص اسے علمِ خارجی میں معروضی طور پر اور آزادیٔ فکر کے ساتھ دیکھتا ہے،

Marfat.com

دوسرا وجدانی طور پر ادراک کرتے ہوئے اور داخلی سطح پر ان خداوندی ہدایات کی روشنی میں دیکھتا ہے جو اسے اللہ کے پیغمبروں کے ذریعے ملتی ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص زندگی اور مذہب کے رشتے کی بات کرتا ہے، زندگی خواہ خام اور سادہ حالت میں ہو یا اپنے کثیر اور شاندار پہلوؤں کے ساتھ، تو اس شخص کو یہ ذہن میں رکھنا ہوگا کہ مذہب کا بنیادی عمل ایک ایسا پل بنانا ہے جو زندگی کی سادگی اور فطری سلاست کو اس کے مکمل اور شاندار ارتقاء سے مربوط کرتا ہو۔ انسان، جیسا کہ ہمیں معلوم ہے، خیر و شر کا ایک ایسا ناقابلِ فہم مرکب ہے جس میں سے کسی عنصر کو بھی آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

میں جس نکتے پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کوئی شخص ذاتی طور پر خیر کی طرف نہیں بڑھ سکتا جب تک کہ وہ پورے عزم کے ساتھ اور بغیر مفاہمت کیے ہوئے شر سے جنگ نہ کرے، خواہ وہ کہیں بھی پایا جاتا ہو۔ شر کی بیخ کنی ہمیشہ کے لیے کر پانا ناممکن ہے بلکہ یہ ایک ایسا کمال ہے کہ ایک بار حاصل ہو جائے تو اس سے ہمیشہ فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ خدا نے اپنے متعدد پیغمبروں کو بنیادی طور پر ایک ہی پیغام دے کر بھیجا مگر ان میں سے کوئی بھی اس دنیا کو ہمیشہ کے لیے ایک مثالی جگہ بنا دینے پر قادر نہ ہو سکا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے خدا قادرِ مطلق ہے، مگر اس نے انسان کو خیر و شر میں امتیاز کرنے کی آزادی بخشی ہے۔ زندگی کی کامیابی یہی ہے اور یہی اس کا المیہ بھی ہے کہ خیر و شر کی قوتوں کا یہ تصادم، ایک طرف عظمت کی بلندیوں تک پہنچنے اور دوسری طرف پستیوں میں گرنے کا رجحان، ایک مسلسل دائمی مظہر رہا ہے۔

صرف مذہب ہی کو نہیں بلکہ دوسری تمام اچھی سماجی قوتوں اور شعبوں کو اس مبارک جنگ میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ ہر نئی نسل از سرِ نو اس جنگ کو شروع کرتی ہے کیونکہ جن مسائل پر قابو پانا ہے اور جن مزاحمتوں کو دُور کرنا ہے، اُن کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ نئی نسل ان سے مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتی۔ اگر مذہب یعنی اس کے پیشوا، علماء اور علمبردار اس زندہ اور دلچسپ ڈرامے میں اپنا رول ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں تو وہ نہ صرف اپنی ایک عظیم ذمے داری ادا کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں بلکہ انہیں پھر یہ ماتم کرنے کا جواز بھی نہیں رہتا کہ عہدِ حاضر میں مذہب کی

Marfat.com

گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے، جیسا کہ ان میں سے اکثر حضرات کہتے ہیں۔ انہیں اپنے آپ کو تقدسِ مآب بنا کر پیش کرنے کی ذہنیت کو بھی ختم کرنا ہوگا۔ گویا وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں کہ خلق ان کا اکرام کرے۔ یہ لوگ خاص انداز کا لباس پہن کر یا دقیق اصطلاحوں میں گفتگو کر کے عوام پر اپنے تقدس اور برتری کا رعب ڈالتے ہیں یا روزمرہ کے کام اپنے ہاتھ سے کرنے میں کسر شان سمجھتے ہیں۔ مثلاً خود میں نے بعض علماء کو یہ بحث کرتے سنا ہے کہ سائیکل پر سواری کرنا یا بازار سے سودا سلف لانا اُن کے شایانِ شان نہیں ہے۔ حالانکہ حضرت مسیح نے کبھی اس طرح نہیں سوچا نہ ہمارے پیغمبرؐ کا یہ اندازِ فکر تھا بلکہ مشرکینِ مکہ تو ہمارے نبی کو دیکھ کر یہ کہا کرتے تھے:

وقالو مال هذا الرسول یاکل الطعام و یمشی فی الاسواق. (۲۵:۷)

(وہ کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو (ہماری طرح) کھاتا پیتا ہے اور بازار میں چلتا ہے۔)

اسی سورۃ میں تھوڑا آگے چل کر یہ حقیقت بھی بیان ہوئی ہے کہ انبیائے سابقین نے نہ کبھی اپنی امت کے ساتھ گھل مل کر رہنا چھوڑا نہ اپنے آپ کو بزرگ و برتر ہستی بنا کر پیش کیا:

وما ارسلنا قبلک من المرسلین الا انهم لیاکلون الطعام ویمشون فی الاسواق. (۲۵:۲۰)

(اے محمدؐ! تم سے پہلے ہم نے جو رسول بھیجے وہ سب کھانا کھانے والے اور بازاروں میں پھرنے والے لوگ ہی تھے۔)

سڑکیں اور بازار اُن پیغمبروں کی تبلیغ کا سب سے پسندیدہ مرکز رہے ہیں۔ خواہ وہ عیسیٰ علیہ السلام ہوں یا ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں یا دوسرے انبیاء ہوں۔ یہ حضرات بسم اللہ کے گنبد میں بند ہو کر نہیں بیٹھے تھے بلکہ اگر زندگی کی گہما گہمی سے تھوڑی دیر کے لیے دامن بچا کر خلوت بھی اختیار کرتے تھے تا کہ اپنے نفس اور خالق کا گہرا عرفان حاصل کر

Marfat.com

سکیں، تو ان کا یہ خلوت کدہ بھی ایسا بسم اللہ کا گنبد نہیں تھا بلکہ وہ کسی پہاڑی کی کھوہ میں یا شہر کے کسی پرانے قبرستان یا صحرا کے کسی گھنے درخت کے نیچے جا بیٹھتے تھے۔ ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ انبیاء کی اس سنت کو تاریخ کے مختلف اَدوار میں ان کے بعض سچے اور مخلص متبعین نے بھی زندہ رکھا ہے۔ وہ فقر و فاقہ میں رہے ہیں مگر اُنھوں نے دُکھ بھری انسانیت سے اپنا رشتہ نہیں توڑا ہے۔ مسلمانوں میں ایسی بہت سی اعلیٰ درجے کی مثالی شخصیتیں ہوئی ہیں جنہوں نے نوع انسان کی خدمت کو اپنا وظیفہ بنا لیا تھا، جو نہ صرف عام انسانوں کی روحانی تربیت کا کام انجام دیتے تھے بلکہ ان کی احتیاج اور نفسیاتی مشکلوں کے وقت میں مادی امداد بھی کرتے تھے۔ وہ پارچہ بانی یا جلد سازی یا کتابتِ قرآن جیسے پیشوں سے اپنی قلیل معاش حاصل کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی اپنی روزمرہ کی عبادت و ریاضت بھی جاری رکھتے تھے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ طرزِ عمل عمومی طور پر تمام مذہبی رہنماؤں کی خصوصیات رہا ہے۔ جب تک وہ مذہب کو اس کی صحیح جگہ پر نہیں رکھیں گے یعنی بازاروں میں، عام لوگوں کے گھروں میں بلکہ ان کے دلوں میں اور میدانِ جنگ میں، جہاں ہر طرف خون خرابا ہوتا ہے، تب تک اس کا گہرا اور بھرپور نفوذ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ان معاملات ہی سے ان کے بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں اور لیتے رہیں گے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا، ہم ان مسائل سے نہ آنکھیں چرا سکتے ہیں نہ دامن بچا سکتے ہیں۔

درحقیقت یہ بہت ہی دشوار بلکہ خطرناک موقف ہے۔ اس کا مطلب ہے سماج کے اجارہ داروں، ظالم حکومتوں، بااثر اور مالدار لوگوں کے خلاف محاذ بنانا جن سے بصورتِ دیگر سرپرستی بھی مل سکتی ہے۔ لیکن تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ مذہب کے سچے پرستاروں نے خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، حق کی حمایت میں سینہ سپر ہو کر خطرات مول لیے ہیں۔ لیکن ایسے قابل احترام حضرات اکا دکا ہی ملیں گے۔ کسی مذہب کی صحت برقرار رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد جس میں نہ صرف مذہبی پیشوا بلکہ عام آدمی بھی شامل ہوں، حوصلہ مندی کے ساتھ شر کی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کو میدان میں کود پڑے

Marfat.com

جنہوں نے معاشرت پر غلبہ حاصل کر رکھا ہو۔

یہاں ہمارا مقصد اسلام کے تمام پہلوؤں کی مکمل تصویر پیش کرنا نہیں ہے، نہ اس کی ساری تعلیمات کا جائزہ لینا ہے، بلکہ اس کا مقصد محدود ہے یعنی اسلام کے بنیادی پیغام کے بعض ان پہلوؤں کو اجاگر کرنا جن کا تعلق خاص طور پر عہدِ حاضر کی زندگی سے ہے۔ مجھے یہ دِکھانا ہے کہ بہتر انسان اور بہتر معاشرے کی تشکیل کے لیے اسلام کی جہد مسلسل عہدِ حاضر میں خصوصی معنویت اور جواز رکھتی ہے۔

میں نے اس کوشش کی جرأت اس لیے اور بھی کی ہے کہ اسلام کی تعلیمات اور مقاصد کے بارے میں آج بھی بہت سی غلط فہمیاں عام ہیں۔ بعض حالات میں یہ غلط فہمیاں بالکل خلوصِ نیت کے ساتھ ہو سکتی ہیں لیکن اکثر حالات میں یہ تاریخی اسباب سے پیدا ہونے والے تعصبات یا بے خبری پر مبنی ہیں۔ جہاں تک خود مسلمانوں کے درمیان ایسی غلط فہمیوں کے وجود کا سوال ہے اس کے متعدد اسباب تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ یہ کچھ تو اس وجہ سے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنی فکر اور انتقادی بصیرت کو اچھی طرح استعمال نہیں کیا جس کے ذریعے فروعات اور زوائد کے انبار سے اصلی تعلیمات کی بازیابی ممکن ہوتی جو صدیوں کے طویل عرصے میں ان کے گرد جمع ہو گئے ہیں اور کچھ اس کا یہ سبب بھی ہے کہ مذہبی علماء ان کے سامنے اسلام کی توانائی، فعالیت اور عصرِ حاضر میں اس کے پیغام کی معنویت واضح کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ وہ اس کا مغز حاصل کرنے کے بجائے پوست ہی سے بہلے ہوئے ہیں۔ مگر کسی حد تک اس کا سبب مذہبی اقدار سے عہدِ حاضر کی بے اعتنائی بھی ہے۔ ان قدروں کی اہمیت کو یا تو آج کے لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں اور بزعمِ خویش مذہب کے مفاد کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کو بھی تیار ہو سکتے ہیں۔ تاہم مذہب کے مقصدِ اصلی کے بارے میں ان کی بے خبری برابر بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ مذہب کے لیے ان کے ایجاب کی نوعیت مختلف ہے۔ اس میں ایک طرف بے اعتنائی اور مایوسی ہے تو دوسری طرف اس کا پیکر مذہبی جنون اور اصلاح دشمنی کا ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی شخص اسلام کے اصلی خط و خال دِکھانے میں کامیابی حاصل کر سکے اور اس کی تعلیمات

Marfat.com

میں جدید دَور سے متعلق کچھ ایسے مضمرات کی جانب اشارہ کر سکے جن کی روشنی میں لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں تو یہ یقیناً ایک مستحسن کام ہوگا۔

دوسرے مذاہب کے ماننے والوں میں بھی اسلام کے بارے میں خوب خوب غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر چہ ان کی نوعیت مختلف ہے۔ یہ صرف ایسے لوگوں ہی میں نہیں ہیں جو اُن ملکوں میں رہتے ہیں جہاں مسلمان خال خال پائے جاتے ہیں بلکہ ان ملکوں میں بھی ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے یا وہ خاصی بڑی تعداد میں بستے ہیں۔ عیسائیوں کی مخالفانہ تنقید کے اسباب تو ہم کسی حد تک صلیبی جنگوں کے سلسلے میں تلاش کر سکتے ہیں جب اسلام اور عیسائیت کا براہِ راست مقابلہ نہ صرف تبلیغ کرنے والے دو بڑے مذہبوں بلکہ دو بڑی تہذیبوں کی حیثیت سے ہوا۔ لیکن اس سب کے باوجود یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اپنی تاریخ کے ابتدائی دَور میں اسلام نے مغربی علوم سے بہت استفادہ کیا، خاص طور سے قدیم ماخذوں میں یونانی زبان کی کتابوں سے۔ اور اس طرح یورپ کے کھوئے ہوئے علمی خزانوں کو گویا مع سود کے انہیں واپس کر دیا۔ پھر اسلام علوم و ثقافت کے مختلف شعبوں کو مالا مال کرنے میں برابر کا شریک رہا۔ لیکن مغرب کے قدیم مصنفین رسول اللہؐ کے بارے میں بہت ہی کم واقفیت رکھتے ہیں اور جب کچھ لکھتے ہیں تو ان کا لب و لہجہ انتہائی توہین آمیز ہوتا ہے۔ یہ بات اس لیے اور بھی افسوس ناک ہے کہ اسلام، جیسا کہ قرآن میں واضح الفاظ میں بتا دیا گیا ہے، نہ صرف عیسائیت سے بہت سی باتوں میں مشابہت رکھتا ہے اور اس کے بانی کا اسی طرح احترام کرتا ہے جیسے وہ اسلام ہی کے عظیم پیغمبروں میں سے ایک ہیں، بلکہ اس نے عیسائی فرقے کے بعض دوسرے افراد کے لیے بھی خصوصی محبت کے جذبات ظاہر کیے ہیں۔

"لتجدن اشد الناس عداوة لِلذین آمنوا الیهود والذین اشرکو، ولتجدن اقربهم مودة للذین آمنوا الذین قالو إنا نصاریٰ ذالک بأن منهم قسیسین ورهباناً و أنهم لایستکبرون.(۸۲) واذا سمعو ما انزل الی الرسول تریٰ

اعینھم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق یقولون ربنا آمنا فاکتبنا مع الشھدین. (المائدہ: ۸۲-۸۳)

(زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تر اُن لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرورِ نفس نہیں ہے۔ جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسولؐ پر اُترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں اور وہ بول اُٹھتے ہیں کہ پروردگار ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔)

لیکن یہ افسوسناک غلط فہمیاں صدیوں سے چلی آتی ہیں۔ اگرچہ اس میں بعض خصوصاً غیر مذہبی عیسائی مصنفین کا خوشگوار استثناء بھی ہے۔ اُنھوں نے اپنی توجہ اسلام کی طرف مبذول کی ہے اور اس کی خدمات کا اعتراف کرنے لگے ہیں۔ اس کے باوجود عیسائیوں میں اب بھی اسلام کا ایک مسخ شدہ تصور پھیلا ہوا ہے۔ یہ لوگ اسلام کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جیسے وہ خیر اور رحم دلی کے جذبات سے عاری ہے اور اسے عام طور پر 'بزورِ شمشیر' پھیلنے والے مذہب کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے جس کا نعرہ یہ ہے کہ کلمہ پڑھو ورنہ موت کے گھاٹ اُترو۔ یہ سمجھنا بہت دشوار ہے کہ دوسرے مذاہب کے ساتھ اسلام کے رویے پر بحث کرتے ہوئے فان گروم بوم (Von Grunebaum) جیسا بلند مرتبہ عالم بھی کہہ اُٹھتا ہے:

''دُنیا مردِ مومن کا حق ہے۔ اس پر ان فرقوں کے کچھ حقوق تو ہیں جن کے پاس وحی الٰہی کا کچھ حصہ موجود ہے لیکن مشرکین کے لیے کچھ بھی نہیں۔ اسلامی شریعت نے بت پرستوں کے لیے صرف ایک ہی راستہ چھوڑا ہے کہ یا تو وہ اپنا مذہب تبدیل کرلیں یا پھر موت کے گھاٹ

Marfat.com

اُتر جائیں۔''

دوسرے مذاہب سے اسلام کے تعلقات پر ہم آگے چل کر وضاحت سے گفتگو کریں گے۔ یہاں تو سردست ان قابلِ افسوس غلط تعبیروں کی طرف سرسری اشارہ کرنا ہی مقصود تھا۔

۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ امریکہ میں ایک کتاب ''Paths of Life'' (زندگی کے راستے) شائع ہوئی تھی جس کے مصنف چارلس موریس ہیں۔ اس میں ایک باب کا عنوان ''طریقِ محمدی (ﷺ)'' بھی ہے جو غلط فہمی اور غلط ترجمانی کی حیرت انگیز مثال پیش کرتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اسلام نے تمام انسانوں کو صرف دو خانوں میں تقسیم کر دیا ہے یعنی مومن اور کافر۔ (جنہیں یہ مصنف مسلم اور غیر مسلم کے مترادف سمجھتا ہے)، پھر کہا گیا ہے کہ اسلام ہر ثواب کو مومن کے لیے اور ہر عذاب کو کافر کے لیے مخصوص سمجھتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ وہ بھی سب کی طرح ایک بشر ہیں، بس اتنا فرق ہے کہ ان کے پاس خدا کی طرف سے وحی آتی ہے، انہیں یہ مصنف اسلام کے نزدیک ''نیم خدا اور نیم بشر'' بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''جو کافر کلمہ پڑھنے سے انکار کریں، ان سے مسلسل جدال و قتال کرو، دشمنی رکھو، اور انہیں موت کے گھاٹ اُتار دو۔''

قرآن نے خدا کو رحمٰن و رحیم کہا ہے اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کو حکم دیا ہے کہ وہ بھی اپنے اندر ایسی ہی ربانی صفات پیدا کریں اور خود آپ کی مبارک زندگی کا اسوۂ حسنہ بھی یہی رہا ہے۔ مگر چارلس موریس اسلام میں اللہ کے تصور کو محمدؐ کی شخصیت کا اظلال ہی سمجھتا ہے اور اس کی جو تصویر اس نے کھینچی ہے وہ اس کی ناواقفیت کے سوا گندے ذہن کی غماز ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقل کے استعمال پر دوسرے تمام انبیاء سے زیادہ اصرار کیا ہے (جیسا کہ ہم آگے چل کر تفصیل سے بحث کریں گے) لیکن اس مصنف کا خیال ہے کہ آپ کی زندگی میں منطق کا کوئی گزر نہ تھا۔ اللہ کا یہ بندہ جس نے اپنی زندگی کی طویل ساعتیں غارِ حراء میں مراقبہ و مناجات کرتے ہوئے گزاری تھیں، جو روزانہ عبادت میں طویل

Marfat.com

قیام وقعود کرتا تھا، اس مصنف کے نزدیک ایسی شخصیت ہے جس کے یہاں خلوت، ترک و تجرید، یا اعتدال پسندی بالکل اجنبی صفات ہیں۔ اس نے آپ کو ایک ایسی شخصیت کے روپ میں پیش کیا ہے جو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہر طریقہ استعمال کرتی تھی۔ ایسی متعصبانہ نظر ہو تو اس کا یہ سمجھنا بھی کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ ''دوسرے انسانوں کو مسلمان صرف ایک دہشت، ایک بلائے ناگہانی یا ایک خونخوار درندے کی شکل میں نظر آتا ہے۔'' آگے چل کر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ مسلمانوں کی طاقت ان کے رہنما، ان کی جماعت اور دشمن کے مقابلے میں ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے حریفوں کو نیست و نابود کرنے کی فکر میں لگے رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کم از کم زمانہ ماضی میں انہیں کبھی ایسی مکمل کامیابی نصیب نہیں ہو سکی جس کے بعد بس وہی وہ باقی رہ جائے۔ ہٹلر نے ساری تحریک اسلام کو اپنے ایک ہی عمل میں دکھا دیا۔ اس کا موازنہ حضرت محمدؐ سے تقریباً جزوی تفصیلات میں بھی مکمل ہے۔ مین کیف (Mein Kampf) کو آج کا قرآن سمجھنا چاہیے۔''

میں نے اس کتاب سے تین اقتباسات پیش کیے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ میں اس کتاب کو کچھ بہت زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آج بہت سے روشن خیال عیسائی بھی اس نظریے کو مکمل طور پر رد کر دیں گے۔ مجھے تو یہاں صرف یہ دکھانا تھا کہ بیسویں صدی کے روشن عہد میں بھی اندھا تعصب ایک ایسے شخص کے دماغ پر کس طرح قبضہ کر سکتا ہے جسے بظاہر 'تعلیم یافتہ' سمجھا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ اس مصنف نے اسلام کی معقول ترجمانی کرنے والے عیسائیوں کی تصانیف کا مطالعہ بھی نہیں کیا ہے۔ قطعاً غیر متعصب مآخذ، قرآنِ کریم یا سیرۃ نبوی کے بارے میں تو وہ یقیناً بالکل نابلد ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ کتاب جس میں دوسرے مذاہب کا تذکرہ بھی ہے کم از کم اسلام کے معاملے میں تو قابلِ رحم حد تک جاہلانہ ہے۔ مگر یہ شائع ہوئی ہے اور اسے ہزاروں انسانوں نے پڑھا ہوگا۔ ان میں کچھ پڑھنے والے بھی اسلام سے ایسے ہی نابلد ہوں گے جیسا کہ یہ مصنف ہے اور وہ ان بیانات کو محض اس لیے سند بنا سکتے ہیں کہ انہوں

Marfat.com

نے ''کتاب میں پڑھا ہے''۔ جو لوگ مذہب کی اہمیت اور شخصیت سازی میں اس کے اثر کو تسلیم کرتے ہیں انہیں اس طرح کے ذہنی اور اخلاقی دیوالیہ پن کے خلاف جہاد کرنا چاہیے۔ جب تک اس کی بیخ کنی نہ ہوگی حقیقی مذہب ہماری زندگی پر اپنا اثر نہیں ڈال سکے گی۔ بہت سے ہندو بھی اسی طرح اسلام کی حقیقی روح کے بارے میں شدید غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں جس کے کچھ سیاسی اور تاریخی اسباب ہیں۔ ہندوستانی تاریخ کے زمانۂ وسطی اور عہدِ جدید میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے سیاسی جھگڑوں نے تعصب کی آگ کو دونوں طرف بھڑکایا ہے۔ تعصب کی عینک لگا کر کسی مذہب یا تاریخ کے بارے میں صحیح اور غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کرنا ہمیشہ دشوار ہوتا ہے۔ اس کے سوا یہ سبب بھی ہے کہ کبھی کبھی مسلمانوں نے بھی اپنی مسخ شدہ اور مکروہ تصویر کشی پیش کی ہے اور مسلمان حکمرانوں نے فوجی چڑھائیاں اور فتوحات کرنے میں ایسی تنگ نظری اور تعصب کا مظاہرہ کیا ہے جو قطعاً اسلام کی روح کے منافی تھا۔

یہاں یہ سوال یقیناً کیا جا سکتا ہے کہ وہ مذہب کون سا ہے جس کے پیرووٴں نے اس طرح کے بلکہ کبھی ان سے بھی بدتر اعمال نہ کیے ہوں لیکن یہ الزامی جواب میرے نزدیک کوئی تسلی بخش موقف نہیں ہے۔ تنقید کرنے والوں نے بہرحال مسلمانوں کے اعمال میں اُن کے عقائد کی جھلک دیکھی ہے۔ میرا عندیہ یہ ہے کہ ایسے معاندانہ تجزیے میں مسلمانوں کو اپنے سیاسی مخالفوں یا نکتہ چینوں سے زیادہ ذمہ دارانہ رویہ اپنانا چاہیے۔ اُن کا کام یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کو اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال میں رچا کر اپنے مذہب کی اچھی اور لبھانے والی تصویر پیش کریں۔ یہ کہنے کے بعد مجھے پہلی بات کو دہرانا ہے کہ الزامی جواب ایک غلط اور عاقبت نااندیشی کا فیصلہ ہوگا۔ اگر تمام مذاہب عالم پر ایسی ہی تنقید ہو سکتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس سے سب مذاہب کے تصور کو گزند پہنچتا ہے۔ مذاہب کے مطالعہ ان کی بہترین تعلیمات کی روشنی میں کیا جانا چاہیے جو وہ نہ صرف اپنے مخصوص پیرووٴں کے لیے بلکہ مجموعی طور پر ساری انسانیت اور تمام عالم کے لیے پیش کرتے ہیں۔

اب یہ سوال اُٹھتا ہے کہ آخر وہ کون سا عظیم اضافہ ہے جو ان میں سے تمام مذاہب

Marfat.com

نے نیکی اور رحم دلی کے جذبات کو فروغ دینے کے سلسلے میں کیا ہے؟ یا جس سے سماجی انصاف کے نظریات کو تقویت ملی ہے اور عام آدمی کو زندگی کی سختیاں جھیلنے میں آسانی ہوگئی ہے، یا جس سے عمومی طور پر انسانی کردار میں اس خیر و شر کی جنگ کے لیے تاب مقاومت پیدا ہوئی ہے، جو اسے ساری زندگی میں اور ہر زمانے میں اور بار بار لڑنا پڑتی ہے۔ اگر ان مذاہب کے پیروؤں نے اپنی عظمت کو کھو دیا ہے تو اس کا سبب ان کی کوتاہ بینی اور کمزوریاں ہیں یا یہ ہے کہ وہ اپنی جبلت بہیمیت سے بلند نہیں ہو سکے ہیں لیکن دوسروں کو سنگ سار کرنے میں پہل کون کر سکتا ہے؟ میرا مقصد تو یہ ہے کہ اسلام کی دعوت و عزیمت کو جیسا میں نے سمجھا ہے اسے دوسروں کو بھی خواہ وہ مسلمان ہوں یا کسی دوسرے بڑے مذہب کے پیرو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے آمادہ کر سکوں!

میری یہ خواہش صرف اس لیے نہیں کہ خود مجھے اسلام سے یا اس کا دفاع کرنے سے دلچسپی ہے۔ مجھے دُنیا کے دوسرے مذاہب کی مفاہمت اور ان کے پیروؤں کے ہمدردانہ مطالعے کو فروغ دینے کے مسائل سے بھی اتنی ہی دل چسپی ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک مذاہب ایک دوسرے پر حملہ کرنے کی نیت سے فوجوں کی طرح صف آرا کھڑے رہیں۔ یہ تو خود مذہب کی روح کے بھی منافی ہے۔ ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان مذاہب میں مماثلت اور مشابہت کے گہرے اور بنیادی عناصر موجود ہیں خواہ وہ ایک سطحی یا متعصبانہ مطالعہ کرنے والے کو ہمیشہ دکھائی نہ دیتے ہوں۔ تاریخ کے ہر دَور میں مذہب کا نشوونما ایک مسلسل تحریک کی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح نہیں کہ گویا متعدد خدا تھے، ہر ایک کا اپنا اپنا علاقہ بٹا ہوا تھا اور وہ اپنے اپنے ماننے والوں کو مختلف اور متضاد احکام بھیجتے رہے۔ قرآن کا کہنا تو یہ ہے:

لو کان فیھما آلھتین الا اللہ لفسدتا. (۲۱-۲۲)

(اگر (زمین اور آسمان میں) ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو فساد یقینی تھا۔)

یہ ایسا نکتہ ہے کہ خدا کے وجود پر ایمان رکھنے والے کسی بھی مذہب کو اسے قبول

۱۳۲۴۸۸
Marfat.com

کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تمام مذاہب کا سرچشمۂ فیضان ذات خداوندی ہی ہے اور اسی نے اپنا پیغام اپنے برگزیدہ بندوں کی وساطت سے مختلف اَدوار میں مختلف اقوامِ عالم کی طرف بھیجا ہے تو اس پیغام کو لازمی طور پر ایک بنیادی وحدت کا حامل ہونا ضروری ہے۔ تفصیلات یا رسوم کا اختلاف ہوسکتا ہے، کیونکہ مادی یا سماجی حالات زمان و مکان کے لحاظ سے خاصے مختلف رہے ہیں لیکن زندگی کی اخلاقی اور تہذیبی بنیادیں اچھے اور باعزت کردار کے اصول، سماجی رشتوں کو چلانے والے ضابطے، اساسی طور پر متضاد نہیں ہوسکتے۔

لیوس ممفرڈ (Lewis Mumford) نے اپنی بصیرت افروز کتاب ''طرزِ زندگی'' (Conduct of Life) میں، جس کا میں نے پہلے بھی کہیں حوالہ دیا ہے، ایسے اہم نکات کی طرف اشارے کیے ہیں جو قدیم مذاہب میں مشترک ہیں۔ ان میں شہادت اور بقائے دوام کا وہ نظریہ بھی شامل ہے جس کی وجہ سے انسان دُنیا کے وقتی مفادات اور ذاتی اغراض کو کسی بڑے نصب العین کی خاطر قربان کرسکتا ہے اور اسی اعتقاد کی وجہ سے اس کو بہت سی جاوداں رہنے والی کامیابیاں حاصل ہوسکی ہیں۔ انسانیت کے ارتقاء کے لیے صرف دنیوی علائق اور وقتی مفادات سے خاص طرح کی بے تعلقی ہی ضروری نہیں ہے بلکہ وہ کبھی کبھی یہ سمجھ کر بھی عمل کرسکتا ہے جیسے واقعی اس کی زندگی جاوداں ہوگئی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اسی بات کو یوں کہا ہے:

دنیائے دنی سرائے فانی سمجھو — ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا — ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

آگے چل کر ممفورڈ اشارہ کرتا ہے کہ جدید علمِ حیاتیات کے تصدیق کرنے سے بہت پہلے مذہب نے زندگی کے حیرت انگیز تاروپود کا وہ تصور پیش کردیا تھا جس کی رو سے تمام جاندار مخلوقات ایک دوسرے کے سہارے زندہ ہیں۔

> ''زندگی میں باہمی انحصار کی حقیقت اور انسان کے لیے کائنات کے مسخر کیے جانے کا مذہب نے ایک مجمل خاکہ پیش کیا تھا۔ پچھلی تین صدیوں میں سائنس نے اپنی متنوع تفصیلات سے محض اس

Marfat.com

اجمال کی بنیادی باتوں کی تصدیق کی ہے اور اس خاکے میں بوقلموں رنگوں کی آمیزش سے خالی جگہوں کو پُر کیا ہے۔"

مذاہب نے انسان پر زندگی کے بنیادی تقدس کا اثر بھی چھوڑا ہے اور یہ وہ نظریہ ہے جس کا دامن موت کے بحران سے بندھا ہوا ہے۔ کوئی متوازن نقطۂ نظر تلاش کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ زندگی اور موت دونوں کو اپنایا جائے۔ خود زندگی بھی خوشی اور غم، آسائشوں اور مصائب کے تانے بانے سے بنتی ہے۔ مذہب کے وسیع نقشے میں انسان کو اس حقیقت کا عرفان حاصل ہوتا ہے کہ وہ موت کی کہنہ کو صرف ترکِ علائق اور ایثار پیشگی کے پس منظر میں سمجھ سکتا ہے۔ لہٰذا اگر مذہب انسان کو ضروریات اور خواہشوں کو محدود رکھنا اور ان پر قابو پانا نہ سکھاتا تو وہ علائق میں اسیر ہو کر رہ جاتا اور اس طرح اپنے ارتقاء اور حقیقی آزادی کے حصول کی صلاحیت کھو بیٹھتا۔ یہ سب کسی ایک مخصوص مذہب کی دین نہیں ہے بلکہ انسان کی زندگی کو مالا مال کرنے میں مجموعی طور پر 'مذہب' کا حصہ ہے اور مذہب کی یہ تحریک جوں جوں بڑھتی رہی ہے، اس نے ہمیں انسان کے تجربات، خواہشات اور امکانات کو سمجھنے کے لیے جدید تر اور بعض اعتبار سے زیادہ گہری بصیرت عطا کی ہے۔ انسان کی زندگی پر اپنا پورا اثر ڈالنے سے مذہب کو اس رجحان نے روکے رکھا کہ وہ اپنے چاروں طرف حفاظت اور علیحدگی پسندی کی دیواریں کھڑی کر کے اپنی جداگانہ اور ایک دوسرے سے حسد کرنے والی مملکتیں بنانے لگ گئے، جنہیں اپنی بہبود کی سوچنے سے زیادہ دوسری مملکتوں کو نیچا دکھانے کی فکر رہی۔ ان مناقشوں نے تاریخ کا چہرہ بھی مسخ کیا ہے اور یہ جھگڑے مختلف مذہبوں ہی میں نہیں بلکہ ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں کے درمیان بھی رہے ہیں۔

جہاں تک اسلام کا معاملہ ہے، دوسرے تمام مذاہب میں صداقت کے عنصر کا اعتراف کرنا صرف سمجھداری یا رواداری کا مظاہرہ ہی نہیں بلکہ حقیقت میں ایک مذہبی حکم ہے جسے کوئی مسلمان اپنے روحانی نقصان کی قیمت پر ہی نظر انداز کر سکتا ہے، جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ قرآن اور حدیث میں اس کا بار بار ذکر کیا گیا ہے کہ خدا نے تمام قوموں کی

Marfat.com

طرف انبیاء مبعوث کیے تھے جن میں سے صرف بعض کا نام لیا گیا ہے اور بہتوں کا نام نہیں آیا ہے نیز یہ کہ پیغمبر اسلام ان انبیائے سابقین کی تکذیب کرنے نہیں آئے تھے بلکہ ان کے پیغام اور تعلیمات کی تصدیق وتوثیق کے لیے بھیجے گئے تھے۔ ان کا احترام اور تمام مذاہب کی عبادت گاہوں کا احترام ہر مسلمان پر واجب کیا گیا ہے۔

بعض حالات میں کچھ فرماں رواؤں یا فاتحوں نے جو کچھ بھی کیا ہو، اسلام میں غیر مذہب کے ماننے والوں بلکہ منکرینِ مذہب کی بھی کسی طرح کی توہین یا ان سے بدسلوکی کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے، اگرچہ اسلام سختی سے توحید پرست مذہب ہے اور شرک یا بت پرستی کا شدت سے مخالف ہے مگر اپنے پیروؤں کو اس نے یہ حکم دیا ہے:

ولا تسبّوا الّذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدواً بغیر علم کذلک زیّنّا لکل امۃ عملھم ثم الی ربھم مرجعھم فینبئھم بما کانوا یعلمون.

(۱۰۸:۶)

(اور (اے مسلمانو!) تم انہیں گالیاں نہ دو جن کو یہ لوگ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں کیونکہ پھر یہ لوگ جہالت کی بناء پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں گے۔)

پھر اگر یہ لوگ خدا کی توہین کریں تو مسلمان جو خود ان کے معبودوں کو برا کہتے ہوں، اس بات پر بگڑنے میں حق بجانب نہیں ہوسکتے۔ کوئی مسلمان خواہ اس کا دنیوی یا مذہبی رتبہ کتنا ہی بلند ہو، اگر ان ہدایات کی خلاف ورزی کرتا ہے تو گویا وہ اپنے مذہب کی تعلیمات کی صریح نافرمانی کرتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور غور کریں کہ وہ فکرِ انسانی کو روشن تر بنانے، باہمی مفاہمت کو فروغ دینے، اور بھائی چارے کا احساس پیدا کرنے میں کیا واقعی مدد کر رہے ہیں؟ یہی وہ اعلیٰ مقاصد ہیں جو اسلام کو روزِ اوّل سے عزیز رہے ہیں۔

مزید برآں، مختلف مذاہب کے درمیان اقدار اور نظریات کے تبادلے کے امکانات کو محدود کرنا یا ایک ہی مذہب (یا رنگ ونسل یا قوم وقبیلہ) کے پیروؤں کے درمیان مکالمے پر

Marfat.com

پابندی لگانا انسان کے روحانی ارتقاء کی رفتار میں سخت رکاوٹ کا باعث ہے۔ ایسی پابندیاں خیالات، عقائد اور آراء کے بہاؤ کو روکتی ہیں اور اس سے ذہنی تجسس کا وہ ارتقاء بھی رُک جاتا ہے جو تلاشِ حق کے لیے اُکساتا ہے اور خیالات کی پراگندگی کو ختم کرتا ہے۔

ہمارے عہد میں جب کہ صرف اشیاء اور اشخاص ہی نہیں بلکہ علوم اور نظریات وافکار اور ہر میدان کے تخلیقی کارناموں کو بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے وسائل خاصے تیز اور مؤثر ہیں، یہ تنگ نظری اور بھی زیادہ قابلِ اعتراض ہو جاتی ہے۔ تجدد کے مخالفین، افکار و اعمال کے بہت سے میدانوں میں جو دیواریں کھڑے کر رہے ہیں، آج کے زمانے میں ان کا کوئی جواز نہیں ہوسکتا۔ (مثال کے طور پر دیکھیے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان باہمی مفاہمت اور رسل و رسائل کی دشواریاں بڑھتی جارہی ہیں۔ صرف سیاسی معاشرتی اور اقتصادی سطح پر ہی لین دین بند نہیں ہوا ہے بلکہ رسالوں، کتابوں، شاعروں، اسکالروں اور کھلاڑیوں کی آمد و رفت سے علمی اور ثقافتی میدان میں جو تبادلہ ہوتا تھا وہ بھی بند ہو چکا ہے۔)

لہٰذا ہمیں اپنے دل و دماغ کی کھڑکیاں اور دروازے ہر اس بات کے لیے کھلے رکھنے چاہئیں جس سے زندگی مالا مال ہے یعنی ہمارے خیالات اور قدریں، ہماری سائنس اور آرٹ، ہمارا فلسفہ اور عقائد، خواہ وہ ہمیں کسی بھی جگہ سے ملیں۔ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مبارک فرمان پر کہ الحکمة ضالة المومن فلیاخذھا این وجدھا. (دانائی کی ہر بات مومن کی متاعِ گمشدہ ہے، جہاں بھی ملے اُسے حاصل کرے۔) اور اطلبوا العلم ولو بالصین. (طلبِ علم کرو خواہ وہ چین میں ملے۔) سچے دل سے عمل کر کے اسے اپنے اعمال میں رچا بسا لینا چاہیے صرف زبان سے اقرار کر لینا کافی نہ ہوگا۔

مذہب کی دنیا میں بھی جہاں لوگ اکثر ضرورت سے زیادہ متعصب یا تحفظ پسند ہو جاتے ہیں ہمیں محسوس کرنا چاہیے کہ اگر ہم دوسرے مذاہب کے صحت مند تصورات کا خوش دلی سے استقبال کرنے کو آمادہ رہیں تو اس سے ہمارے اپنے مذہب کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوگی کیونکہ آخر دوسرے مذاہب کا سرچشمہ بھی ذاتِ خداوندی ہی ہے۔ عام طور پر مدرسہ ہائے فکر

Marfat.com

ہوں، یا فلسفہ وعقائد کے دبستان، یہ اتنے بودے اور شکی ہوتے ہیں کہ غیروں کے خیالات و عقائد سے میل جول بڑھانے سے ڈرتے ہیں، اُن کا عام رجحان محدود اور بند ہو کر رہنے کا ہے اور وہ دوستانہ مکالمے یا تقابل کو پسند نہیں کرتے کیونکہ اس سے انہیں اپنے اندازِ نظر میں تبدیلی پیدا ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے یا اس طرح کچھ ایسے نئے سوالات سامنے آسکتے ہیں جو ان لوگوں کو ناگوار گزریں جو حق کے تنہا اجارہ دار ہونے کا دعویٰ رکھتے ہوں۔ یہ لوگ حق پر ہونے کا دعویٰ ضرور کریں مگر انہیں یہ حق نہیں کہ شبہات اور سوالات کو پیدا نہ ہونے دیں۔ یہ رویہ سماجی اور طبیعی علوم میں معقول نہیں سمجھا جاتا تو اسے مذہب یا فلسفے میں کیوں معقول سمجھا جائے؟ کسی زندہ اور نامیاتی مذہب کو اس کی حمایت نہیں کرنی چاہیے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ اسلام دوسرے مذاہب سے یا جدید افکار سے ایک بار آور مکالمے کی ابتدا نہ کرے۔ ان میں سے بعض افکار کو وہ قبول کر سکتا ہے اور بعض کو ردّ کر سکتا ہے مگر بشمول اسلام اگر کوئی مذہب بھی اچھی طرح سمجھے پرکھے بغیر ان افکار کو رد یا قبول کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو یہ کوئی دانائی کی بات نہیں ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ اسلام کے پاس عصر حاضر کو دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔ اسے اپنے پیروؤں کے سامنے بھی اپنی تعلیمات کو دانش مندی کے ساتھ پیش کرنا چاہیے اور انہیں انسان کی فکری میراث کے مشترک خزانے میں بھی اضافہ کرنا چاہیے۔ اس طرح اگر دوسرے مذاہب کے مرد و زن شعور یا غیر شعوری طور پر اسلام کے کچھ اصول و نظریات کو اپنے افکار میں جذب کر سکیں، جیسا کہ تاریخ کے ارتقاء میں ہوا بھی ہے تو کیا خدا کے مقصدِ ہدایت میں اس کی کچھ اہمیت ہوگی کہ وہ لوگ ان نظریات کے اصل مصدر اور ماخذ کا اعتراف بھی کرتے ہیں یا نہیں!

قرآن نے بار بار کہا ہے کہ نجات اور فضیلت کسی خاص مذہب کا اجارہ نہیں ہیں اور تمام مذاہب کے ماننے والوں میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو مذہب کے اخلاقی ضابطوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ خدا ان سب کا احتساب عدل و انصاف کے ساتھ کرے گا کیونکہ اس نے اپنی

Marfat.com

سب مخلوق کے لیے جزا و سزا کا ایک ہی معیار رکھا ہے۔

اسی طرح اگر اس بات کی صحیح ترجمانی ہو کہ عہدِ حاضر کے سامنے مذہب کو کس طرح پیش کیا جائے اور اس کی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے کن قدروں پر زیادہ زور دیا جائے اور دوسرے مذاہب اور ان کے رہنماؤں کے تجربات مسلمانوں کے تجربے میں کچھ اضافہ کرنے والے ہوں، تو اس کا بھی کھلے دل سے استقبال ہونا چاہیے، نہ یہ کہ اسے حقارت سے ٹھکرایا جائے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ایک بار کہا تھا کہ ''جو ملاتا ہے وہ دھرم ہے جو توڑتا ہے وہ ادھرم ہے۔'' اور اسلام کا عظیم ورثہ یہی ہے کہ اس نے امن اتحاد اور ساری نوعِ انسانی سے ہمدردانہ تعلق رکھنے پر زور دیا ہے۔

جو اعداد و شمار دستیاب ہوئے ہیں ان کی رُو سے ۱۹۶۸ء میں مسلمانوں کی آبادی ساری دنیا میں کم از کم ۵۰ کروڑ تھی۔ 'انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا' اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی تصنیف 'اسلام' کی رُو سے یہ تعداد کم از کم ۵۰ کروڑ ہوتی ہے۔ اگر عیسائیوں کے تمام فرقے کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور راسخ العقیدہ مشرقی چرچ وغیرہ کو ملا کر دیکھا جائے تو عیسائیوں کے بعد مسلمانوں کا نمبر ہے۔ باعتبارِ تناسب یہ دنیا کی کل آبادی کا بہت بڑا حصہ ہے اور دوسری بہت سی اہم وجوہ کے علاوہ مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ ساری دُنیا کا فائدہ اسی میں ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کا ہمدردانہ مطالعہ کیا جائے اور اُنھوں نے انسانیت اور فکر و تہذیب کے ارتقاء کے لیے، یا زمین پر زندگی کا ماحول صالح بنانے کے لیے جو کچھ کیا ہے یا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اُس کا اعتراف کیا جائے (میں یہی بات اجمالاً دنیا کے دوسرے تمام مذاہب کے لیے بھی کہتا ہوں)۔ اسی طرح مسلمانوں کا مفاد اس میں ہے کہ وہ دوسرے عالمی مذاہب پر غور کریں کہ اُنھوں نے دنیا کو بالفعل کیا دیا ہے اور بالقوۃ کیا دے سکتے ہیں؟

انصاف، ہمدردی اور ہر اہم اور حیات بخش چیز کی قدر و قیمت کا اعتراف کرنے کے لیے آمادگی کا ایسا رویہ زمین پر امن و آشتی کی ضمانت کے لیے کافی نہیں تو ضروری یقیناً ہے کیونکہ اس کا افسوسناک حد تک فقدان ہے۔ ایسے لوگ خاصی بڑی تعداد میں ہیں جو مختلف

Marfat.com

مذاہب میں ناروا داری، تعصب اور رسا کشی کو خوبی کی بات سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے یا منشائے الٰہی کی صحیح ترجمانی کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ یہ تو برہما، گاڈ، یزداں، یا اللہ کا بہت ہی پست تصور ہوگا کہ ہم اس ذاتِ بے ہمتا سے ایسے مقصد و منشاء کو منسوب کرنے لگیں جسے کوئی مہذب انسان بھی اپناتے ہوئے شرم محسوس کرے گا۔

آفاقی انسان کا تصور:

میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ اس نے آفاقی انسان کے تصور کو اُجاگر کرنے میں مدد دی ہے۔ انسانی تاریخ میں دو رجحان کارفرما رہے ہیں اور ان دونوں میں ہمیشہ سے رسا کشی بھی ہوتی رہی ہے۔ انسان جب تاریخ کے منظر پر آیا تو وہ اپنی زمین، جغرافیہ اور موسم کے بندھن میں جکڑا ہوا تھا اور بے شمار صدیوں تک ان حالات میں اسیر رہنے کے بعد اب ان بندھنوں کو کچھ کچھ ڈھیلا کر سکا ہے۔ موسم کے سرد و گرم ہونے کا اختلاف، زمین کی زرخیزی میں کمی بیشی، آزاد پھرنے والے چوپایوں کا پھیلاؤ جو اکثر انسان سے زیادہ طاقت ور تھے، ان میں سے کوئی بات بھی زندگی کے اُس توازن کو کسی وقت بھی درہم برہم کر سکتی تھی جسے انسان نے بڑی مشقت کے بعد حاصل کیا تھا۔

لاکھوں برس میں انسان نے بستیاں بسا کر قبائل کی صورت میں رہنا سیکھا، جہاں اپنے اور مویشیوں کے لیے غذا حاصل کر سکے اور اُس کا ذخیرہ بھی رکھ سکے۔ یہاں اس نے چھوٹے چھوٹے جتھے بنائے جو ہمیشہ ایک دوسرے پر غراتے رہتے تھے کیونکہ مشکل سے حاصل ہونے والے غذا کے وسیلوں پر قبضہ جمائے رکھنے کے لیے جھگڑا ہونا ناگزیر تھا۔ اُس عہد کے انسان کی وفاداریاں صرف اپنے قبیلے کے ساتھ ہوتی تھیں اور وہ قبائلی رسوم و رواج میں بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ اس کا اخلاق اور کردار بھی قبیلے کے طرزِ زندگی سے تشکیل پاتا تھا۔ آسٹریلیا کے ایک قدیم وحشی قبیلے میں یہ رسم ہے کہ جب قبیلے کا سردار جنگل میں ٹہلنے کو نکلے تو قبیلے کے ہر فرد کو چاہیے کہ وہ زمین پر دراز ہو جائے۔ ان کے آبا و اجداد جو کچھ کرتے رہے ہوں، اُسے اُن کی نگاہ میں ایک طرح کا تقدس حاصل ہو جاتا تھا، پھر وہ طویل زمانے تک ان کے خیالات اور

Marfat.com

روایات کی تقلید کرتے رہتے تھے اور ایسا کرنے کے لیے یقیناً تھوڑا سا جواز بھی موجود تھا کیونکہ ان کی دُنیا چاروں طرف سے بھانت بھانت کے معلوم اور مجہول خطروں میں گھری ہوئی تھی اور انہیں گزرے ہوئے لوگوں کی حکمتوں سے ہی جینے کا حوصلہ ملتا تھا۔ لیکن جب ذہن اس رویے میں پختہ ہو جاتا ہے تو یقیناً ترقی کی راہ مسدود ہونے لگتی ہے۔ ایسا ذہن رجعت پسند ہوتا ہے، حالت موجودہ میں کوئی انقلاب نہیں چاہتا اور رسوم و روایت کی بالادستی پر اصرار کرتا ہے۔ جدت خواہ اعمال میں ہو یا افکار میں، اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ یہ ذہنیت دُنیا کے سبھی علاقوں اور تہذیبوں پر صدیوں تک حاوی رہی ہے اور آج تک بھی ہے۔ حق کو تلاش کرنے اور اُسے قبول کرنے کی راہ میں اکثر یہی بھاری پتھر ثابت ہوتی ہے۔ قرآن اس ذہنیت سے بار بار خبردار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ سابقہ امتوں کی طرح عرب کے اصنام پرست بھی حضرت پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت کے جواب میں یہ کہتے ہیں:

> ''اور جب کہا جاتا ہے اُن کو کہ آؤ اس کی طرف جو کہ اللہ نے نازل کیا اور رسول کی طرف تو کہتے ہیں ہم کو کافی ہے وہ جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادوں کو۔ بھلا اگر ان کے باپ دادے نہ کچھ علم رکھتے ہوں اور نہ راہ جانتے ہوں تو بھی ایسا ہی کریں گے؟'' (المائدہ، ۵:۱۰۴)

اسلام کا نہایت واضح نظریہ ہے کہ طریقِ آباء کی آڑ لے کر کسی حقیقت یا برتر صداقت کو جھٹلانا غلط اور غیر منصفانہ ہے۔ قرآن اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتا ہے:

> ''ایمان والو! تم پر لازم ہے فکر اپنی جان کا، تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا جو کوئی گمراہ ہوا جب کہ تم ہوئے راہ پر۔ اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے تم سب کو، پھر وہ جتا دے گا تم سب کو جو کچھ تم کرتے تھے۔'' (المائدہ:۱۰۵)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ساری دُنیا ہٹ دھرمی اور باطل پرستی کی راہ اختیار کر لے

Marfat.com

تب بھی یہ ہمارے لیے اتباع کرنے کا جواز نہیں ہو سکتا۔ حق جہاں بھی ہو اس کے لیے ثابت قدم ہونا چاہیے کیونکہ ہر فرد آخرت میں اپنے کردار کا خود جوابدہ ہو گا۔

کاروانِ تہذیب آگے بڑھتا رہا اور انسان آہستہ آہستہ قبائلی دور سے نکلا، اس نے اپنے آپ کو زیادہ بڑے گروہوں میں منظم کیا۔ گاؤں، قصبے، شہر، ملک اور بادشاہت کی تشکیل کی۔ اب اس کے فکر و عمل کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا گیا اور نئے حالات نے مہذب زندگی گزارنے کے نئے تصورات کا تقاضا کیا۔ نئی قانون سازی ہوئی، جھگڑوں کو طے کرنے کے نئے ذرائع ڈھونڈے گئے، آئے دن پیچیدہ تر ہوتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے وسیلوں کی مانگ بڑھی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض دیدہ ور شخصیات نے، خواہ وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، مسلسل کوشش کی ہے کہ وہ نئے تقاضوں کی تکمیل کے لیے طرزِ فکر اور نظریات کی جدید تنظیم کریں اور بعض پہلوؤں سے انہیں خاص کامیابی بھی ہوئی ہے۔ اب وہ پرانی قبائلی وفاداریاں نئے قومی نظریات میں بدل گئی ہیں اور ایک نیا ابھرتا ہوا احساس ''عالمگیر انسانیت'' (ورلڈ کمیونٹی) کا بھی ہے جسے عہدِ حاضر کی مشینی ترقیوں نے صرف خوش آیند ہی نہیں بلکہ ضروری بنا دیا ہے۔

اپنی بدعنوانیوں اور رجعت پسندی کے باوجود، مذاہب نے اس تبدیلی کے لانے میں خاصا اہم رول ادا کیا ہے۔ اتنا اہم کہ درحقیقت مذہب کی وجہ سے یہ بیل منڈھے چڑھ سکی ہے، لیکن یہ ایک دائمی اور مسلسل جدوجہد ہے۔ جو علاقہ فتح کیا جائے اُس کی حفاظت بھی پوری چوکسی کے ساتھ کرنا پڑتی ہے کیونکہ ایسی بہت سی طاقتیں ہیں جو ان کامیابیوں کو خاک میں ملانے کے درپے رہتی ہیں۔ بعض لوگ خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں اور بعض ۲۰ویں صدی کے بارے میں سوچتے ہیں کہ اب ظلم و تعدی اور مطلق العنانی کا زمانہ گزر چکا ہے، مگر پھر بھی کوئی ہٹلر، کوئی مسولینی، کوئی اسٹالن، خاص مغربی تہذیب کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اور بدترین قسم کی بربریت کو کھلی چھٹی دے دیتا ہے۔ یا مثلاً آج سے صدیوں پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے محبت اور رحم دلی کے پیغام کی تبلیغ کی تھی اور جب یہ مذہب دُنیا کے بڑے حصے میں شائع ہو گیا تو اسی مذہب کے رہنماؤں کے زیرِ اقتدار عدالت احتساب (Inquisition) نے اسے کوڑوں، شکنجوں اور آگ

Marfat.com

کی بھٹیوں کے روپ میں بدل دیا۔ یہ پکڑ دھکڑ جو اکثر ایک ہی مذہب کے پیروؤں کے درمیان خوں ریز جنگ کی شکل اختیار کر لیتی تھی اُس خدا کے نام کی سب سے بڑی بے حرمتی تھی جسے تقریباً تمام مذاہب میں رحمٰن و رحیم کہا گیا ہے۔

مذاہب کا مقصد اگرچہ ان تفرقوں کی دیواروں کو ڈھانا تھا جنھوں نے انسان کے قلب و دماغ کو جکڑ لیا ہے اور وہ انسانی اخوت کا پرچار کرتے تھے مگر انہیں بھی برادر کشی اور خون ریزی کے لیے آلۂ کار بنایا گیا اور عوام کو ان لڑائیوں میں جھونکنے کے لیے جنت کے وعدے اور دوزخ کی وعیدیں استعمال کی گئیں۔ گویا خدا بھی (العیاذ باللہ) حسن بن صباح کی طرح ہو گیا جو حشیشیوں کو اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل کے لیے سبز باغ دکھاتا تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ماضی کے کسی بھی دَور کے مقابلے میں آج ہمارے عہد کی جنگ زیادہ تر وحشیانہ اور ہمہ گیر ہو چکی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے بہت ترقی کر لی ہے اور انہیں جنگ و جدال کے نئے طریقوں میں بہت زیادہ موثر اور سفاکانہ طور پر استعمال کیا جانے لگا ہے۔ اب یہ بہت زیادہ 'غیر شخصی' اور خوفناک بھی ہوتی جاتی ہے اور ایسی ناقابلِ تصور تباہ کاریاں آناً فاناً پیدا کر سکتی ہے کہ حملہ کرنے والے کو اپنے ہدف مظالم سے ذاتی طور پر واقف ہونے کا موقع بھی نہیں ملتا جو وہ یہ جان سکے کہ اس نے لاکھوں بے گناہ مرد و زن اور معصوم بچوں پر کیا ظلم ڈھایا ہے؟ یہ بات تو یقیناً بہتوں کو معلوم نہیں ہو سکتی کہ آنے والی نسلوں پر ان وحشیانہ اقدامات کے کیا دُور رس اثرات مرتب ہوں گے۔ اس کے باوجود ایسے احمق، ناعاقبت اندیش، بے حس اور کٹھور انسان بھی ہیں جو خود ہمارے دیش میں بھی بڑی طلاقت لسانی کے ساتھ ایٹم بم بنانے کی حمایت کرتے ہیں تاکہ ہم بھی فلاں اور فلاں ملک کی ہمسری کر سکیں۔ اس کی بجائے یہ نہیں کرتے کہ اپنی اجتماعی قوت کو کام میں لا کر جہاں جہاں ایٹمی اسلحہ کے ذخیرے موجود ہیں انہیں ختم کرنے کی جدوجہد کریں۔ ساری قومیں موت اور تباہی کے اس چکر کو پھیلاتی جا رہی ہیں اور اس خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ وہ اسے کبھی استعمال نہیں کریں گی۔

اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ تو اس کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ انسان نے جو کچھ

Marfat.com

ترقیاں کی ہیں، وہ اس کے رگ و ریشے میں پیوست بہیمیت کو ختم نہیں کر سکی ہیں۔ جب بھی اس درندگی کو سازگار ماحول ملتا ہے وہ پھر زندہ ہو کر سر اُٹھانے لگتی ہے۔ پھر بھی یہ سچ ہے کہ خیر سگالی اور رحم دلی کے جذبات کی تبلیغ کرنے والے عظیم اور صاحبِ فکر و نظر مرد و زن، بلکہ بعض حالات میں ان صفات کی حامل پوری پوری جماعتوں نے اس دکھوں بھری زندگی کو ہر زمانے میں باوقعت بنائے رکھا ہے۔ وہ اپنے علاقے اور مذہب کی وفاداریوں سے بلند ہو گئے ہیں مگر کچھ اور بھی زنجیریں ہیں جو ان سے بھی زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔ مثلاً رنگ، نسل، عقیدہ، قوم اور قبیلہ--- جن میں وہ بندھے ہوتے ہیں اور جن کے لیے اپنی جان اور آن کی بازی لگا دیتے ہیں۔ ایسا ہمیشہ اُن کی خواہش اور کوشش سے ہی نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی وہ مفاد پرستوں یا سماجی رجعت پسندوں کا آلۂ کار بھی بن جاتے ہیں جو اُن کی آڑ لے کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنی نظم 'وطنیت' میں کہا ہے کہ تہذیب حاضر نے نئے نئے بت تراش لیے ہیں:

ان تازہ خداؤں میں سب سے بڑا وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

۲۰ ویں صدی کی پہلی دہائی میں یہ ریمارک کسی کو بہت سخت معلوم ہو سکتا تھا مگر اُس وقت سے اب تک حالات نے ایسی کروٹیں لی ہیں کہ 'قومیت' کا یہ تصور اپنے خالص سیاسی مفہوم میں صرف مذہب ہی کے لیے خطرہ نہیں بلکہ عالمی برادری کی تشکیل اور اس مقصد کے لیے جن رویوں کو اپنانے کی ضرورت ہے اُس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن رہا ہے۔

انسانی شعور بھی اتنی شدت سے علاقوں میں محصور ہو گیا ہے کہ زیادہ رواداری اور رحم دلی پیدا کرنے کی بجائے یہ انسانوں کو محدود علاقائی وفاداریوں کے سبب پیدا ہونے والے جھگڑوں میں الجھا سکتا ہے۔ دنیا کو تاخت و تاراج کرنے والی کتنی ہی جنگیں ہیں جن میں اس جارحیت پسند تصورِ قومیت نے آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک قتل و خون پر آمادہ رہنا حب الوطنی کا معیار ہے۔ ایسے لوگ رحم دلی یا مقصدِ انسانیت کا وسیع تر تصور رکھنے کو ''وطن دشمنی'' کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔

Marfat.com

لیکن تنگ نظری کی لعنت کا یہ آسیب صرف ہمارے ہی بین الاقوامی تعلقات پر اثر انداز نہیں ہو رہا ہے بلکہ ایک ہی قوم کے مختلف طبقات میں بھی جو صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے بستے آئے ہیں اور جنہوں نے طویل زمانے تک شانہ بشانہ رہ کر کام کیا ہے اور ایک دوسرے کے دُکھ سکھ میں شریک رہے ہیں، تعصب کا زہر کھول دیا ہے۔ اور وہ صرف اس لیے ہو رہا ہے کہ کچھ افراد یا فرقے کسی دوسری نسل یا رنگ یا عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں یا ان کے سیاسی نظریات کچھ مختلف ہیں۔ یہ ناروا داری جو قوموں کے روابط پر اثر انداز ہو رہی ہے، اس کی چھوٹ فرقوں کے باہمی تعلقات پر بھی پڑتی ہے۔ اس ذہنیت کی مثالوں کے لیے ہمیں تاریخ میں زیادہ دُور تک جانے کی ضرورت نہیں ہوگی، اس کا مشاہدہ آج بھی دُنیا کے کسی بھی ملک میں کیا جا سکتا ہے۔ اسے قوم، مذہب، ذات پات، سیاست یا دوسرے اختلافات سے شہ ملتی ہے جنہیں لوگ زیادہ شدت سے اپناتے جا رہے ہیں کیونکہ ہم نے اب تک بھی اپنے اندر وہ رواداری پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی ہے جو مل جل کر زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے۔ جب تک ہم ان بندھنوں سے چھٹکارا نہیں پائیں گے جو ہمیں فکرِ مستقیم اور انسان دوستی سے روکتے ہیں اور ہمارے نرم و نازک دلوں کو پتھر بنائے دے رہے ہیں اُس وقت تک ہمیں کسی طرح کا حقیقی ارتقاء نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سارے علاقائی رشتے یا ہم مذہبوں اور ہمسایوں سے ہمارے گہرے تعلقات قابلِ ملامت ہیں، مگر اس میں بھی شک نہیں کہ یہ اگر رکاوٹ بننے لگیں اور انسانیت کے بڑے دھارے اور ہمارے مخصوص فرقے میں تصادم کی صورت پیدا کرنے لگیں تو ہمیں ضرور بروقت چوکنا ہو جانا چاہیے۔ محض اختلافات قابلِ سرزنش نہیں ہوا کرتے کیونکہ ان میں سے بعض مثلاً لسانی، تہذیبی یا فنی اختلافات نے انسان کے ثقافتی ورثے کو مالا مال کیا ہے اور اسے گہری معنویت عطا کی ہے، البتہ نیکی، رواداری اور باہمی مفاہمت کے جذبات میں کوتاہی کرنے سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں اور مذہب کا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان خوبیوں کو پیدا کرنے کی لگاتار کوشش کرتا رہے۔ مگر بہت افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مذہب نے یہ رول صرف کبھی کبھار ادا کیا ہے اور اس کا جتنا التزام تاریخ

Marfat.com

کی دوسری قوتوں پر عاید ہو سکتا ہے، فرقہ بندی کے رجحان پر اس کی ذمہ داری اُس سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اور بھی زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ مذاہب کے بنیادی مقاصد کے خلاف ہوا ہے۔ دُنیا کے بڑے کلاسیکی مذہبوں کے وجود میں آنے سے پہلے ابتدائی مذاہب نے بھی اپنے اپنے انداز میں انسان کو ذہن و نظر کی وسعتیں عطا کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ احساس دلایا تھا کہ انسان کا اس کائنات اور سورج اور ستاروں سے کچھ رشتہ ہے جو اس کی تقدیر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان میں حیات بعدِ موت کا تصور بھی موجود تھا، جسے وہ اپنے وحشیانہ انداز میں ظاہر کرتے تھے۔ اس کی جھلک ہم تدفین کے ان طریقوں میں دیکھ سکتے ہیں جو مثلاً فراعنہ مصر کے لیے اختیار کیے گئے۔ انہیں ساری روزمرہ استعمال کی چیزوں کے ساتھ دفنایا جاتا تھا جن کے بارے میں خیال تھا کہ اس دنیا میں دوبارہ آتے وقت اُن اشیاء کی ضرورت ہوگی۔ ان ابتدائی تصورات نے بھی انسان کی زندگی کو کچھ نئی معنویت اور گہرائی عطا کی تھی مگر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور کلاسیکی مذاہب نے ذہنِ انسانی کی تشکیل شروع کی تو نہ صرف بنی نوع انسان میں، بلکہ ساری کائنات میں ایک ربط و اتحاد کا تصور پیدا ہوا۔ لیوس ممفورڈ (Lewis Mumford) نے بڑی بصیرت کے ساتھ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان نے عالمی برادری کا ایک فرد اور ایک آفاقی انسان بننے کا اپنا سفر کس طرح طے کیا ہے۔ تزکیۂ باطن کی مدد سے انسان اپنے آپ کو مقامی جتھوں کی تقدیر سے الگ کرتا ہے اور ایک وسیع تر کائناتی معاشرے کا رکن بن جاتا ہے۔ ابتدا میں یہ صرف ایک تصور تھا، مگر نئے مقاصد اور نئی بصیرتوں کے ساتھ وہ دل شکن تاریخی تجربات اور زمینی فرقہ بندیوں سے بلند ہوتا گیا۔ اس عمل میں آپ 'شخص' کی پیدائش کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ اور اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس کی بدولت اس متحدہ انسانیت کا ابھرنا ممکن ہو سکا جو اب تک ناقابلِ عبور ثقافتی دیواروں سے بٹی ہوئی تھی۔ اس تبدیلی سے انسان کے وہ زمین اور خون کے رشتے بھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں جو اسے اپنے محدود ماضی سے وابستہ رکھے ہوئے تھے۔ گویا اب یہ پوری دُنیا اس کا گھر اور سارے انسان اس کے بھائی ہو گئے --- پہلے وہ زمین میں محصور تھا --- آخر کار اُسے اپنی سمت مل گئی اور اب وہ عالمی

Marfat.com

برادری کے تصور کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔

اب ان کا مقابلہ اقبال کے ان اشعار سے کیجیے:

جرأت ہے تو افکار کی دُنیا سے گزر جا
ہیں بحر خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے
کھلتے نہیں اس قلزم خاموش کے اسرار
جب تک تو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے

یہاں بھی آپ کو زمان و مکان کی بندشوں کا بے باکانہ انکار ملے گا۔ اقبال نے بھی یہی کہا ہے کہ خارجی طاقتوں کے آگے بے بس ہو کر جھکنا نہیں چاہیے بلکہ اپنی داخلی قوتوں پر اعتماد قائم رکھنا چاہیے۔

اسلام جس بنیادی نظریے کی تبلیغ کرتا ہے اور اسے ساری دُنیا کے مرد و زن کے ذہنوں میں بسا دینا چاہتا ہے وہ 'امن' کا تصور ہے۔ خود لفظ 'اسلام' جیسا کہ عربی زبان سے معمولی واقفیت رکھنے والے بھی جانتا ہے 'سلم' سے مشتق ہے جس کے معنی امن و آشتی کے ہیں۔ اس مذہب کا نام 'محمڈن ازم' نہیں ہے جیسا کہ اکثر مستشرقین غلطی سے لکھتے رہے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس مذہب کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا، بلکہ آپ کی تشریح کے مطابق یہ ایسا مذہب ہے جس کی تبلیغ کے لیے آپ مبعوث ہوئے اور جس کا مقصد تمام بنی نوع انسان کے لیے امن و سلامتی کا حصول ہے۔ دُنیا بھر کے مسلمانوں میں سلام کا معروف طریقہ 'گڈ مارننگ' یا 'گڈ ایوننگ' نہیں، بلکہ 'سلام' یا 'السلام علیکم' ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ 'تم پر سلام (سلامتی) ہو' (خواہ تم کوئی بھی ہو)۔ یہی یہودیوں کے سلام 'شیلوم' کا حال ہے۔ قرآن میں بھی اس مذہب کا صرف ایک ہی نام ملتا ہے اور وہ ہے 'اسلام'۔ ارشاد ہوتا ہے:

"ان کے پاس کوئی نئی آیت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ جس طرح کی رسالت خدا کے پیغمبروں کو ملی ہے، اسی طرح کی رسالت ہم کو نہ ملے، ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ اس کو خدا ہی خوب جانتا ہے کہ

Marfat.com

رسالت کا کونسا محل ہے اور وہ اپنی پیغمبری کسے عنایت فرمائے...

(الانعام: ۱۲۴)

اگر اس آیت کو اس تشریح کی روشنی میں دیکھا جائے تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ کریم نے لفظ 'اسلام' کے سلسلے میں پیش کی ہے تو اس سے یہ مطلب ہرگز برآمد نہیں ہوتا کہ سچی ہدایت خود بخود اُس شخص کو مل سکتی ہے جو رسمی طور پر اس مذہب سے وابستہ ہو جائے جسے 'اسلام' کہا جاتا ہے۔ اکثر مسلمان بھی اس غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں اور کسی حد تک یہ اس حدیث کے سبب سے بھی ہوا ہے جس کا پایۂ استناد مشتبہ ہے اور جس میں حضرت ابوذر غفاریؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ "من قال لا الله الا الله، دخل الجنة." اور جس کے مفہوم میں غالباً یہ بات شامل سمجھ لی گئی ہے کہ "خواہ اس کے اعمال کچھ بھی ہوں۔"

درحقیقت یہ ایک موضوع حدیث ہے کیونکہ قرآن میں ہر جگہ عقیدہ اور عملِ صالح کو ساتھ ساتھ رکھا گیا ہے اور ہر بار اعمالِ صالحہ کی ضرورت پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے اپنی کتاب 'اسلام' میں بڑی بالغ نظری کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

> "بدقسمتی سے اس تعریف کو محض "تشریعی" مفہوم میں نہیں سمجھا گیا بلکہ بعد میں یہ بھی سمجھا جانے لگا کہ یہ اسلام کی روح کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جب باعتبار ظواہر بنیادی عقیدہ اور اخلاقی معاملات میں اتنا واضح فرق قبول کر لیا جائے گا تو ظاہر پرستی سے بننے والے احساسِ تحفظ کے ہاتھوں دونوں ہی کو نقصان اُٹھانا پڑے گا اور اس کا عام اثر عوام کے سخت رویوں پر یہ ہوا کہ وہ اسلام کے رسمی اور ظاہری پہلوؤں پر اس حد تک زور دینے لگے کہ اُنہوں نے اس کی اخلاقی اور روحانی قدروں کو بھی تج دیا ہے۔"

Marfat.com

(II)

مکہ اور مدینہ کے جن باشندوں کے سامنے رسول اللہ ﷺ نے اپنا پیغامِ امن پیش کیا تھا، ان میں زبردست مخاصمت رہی تھی اور کئی بار خونریز لڑائیاں بھی ہوئی تھیں۔ مگر یہ آپ کی شخصیت اور تعلیمات کا معجزہ تھا کہ اسلام قبول کرتے ہی ان خوں خوار لوگوں کی کایا پلٹ گئی۔ اسلام نے صرف محبت، اخوت اور مساوات ہی کا حکم نہیں دیا بلکہ یہ سبق بھی سکھایا کہ وہ اپنے اندر اور اپنے قبائل میں ایسے لوگ پیدا کریں جو دوسروں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے خود کو وقف کر دیں۔

> ''اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت بلاتے نیک کاموں پر اور حکم کرتے پسند بات کو اور منع کرتے ناپسند کو اور پہنچے وہی مراد کو۔'' (۳:۱۰۴)

اس تعلیم کی صدائے بازگشت ہمیں صرف مذہبی صحائف ہی میں نہیں بلکہ اس عہد کی ثقافت، شعر و ادب اور مسلمانوں کے فلسفے میں بھی ملے گی جیسا کہ یہ بلاشبہ دوسری ثقافتوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اُردو کے عظیم شاعر غالب نے اسی بات کو حکیمانہ ایجاز کے ساتھ یوں کہا ہے:

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

Marfat.com

یہ اُسی وقت ممکن ہوتا ہے جب 'اَنا' دوسروں کی 'اَنا' کے لیے لبیک کہنے والی اور بہت حساس ہو جائے۔ اُن کے دُکھ سکھ میں شریک ہو، اُن سے قوت حاصل کرے اور انہیں قوت عطا کرے، تب کہیں زندگی اپنے پورے امکانات اور صلاحیتیں ظاہر کرتی ہے۔

علامہ اقبال جو نظریۂ خودی کے علاوہ تعلیماتِ اسلامی کی روح اور اُس کے فلسفے کے ترجمانوں میں سے ایک ہیں، یہ مانتے ہیں کہ شریفانہ، انسانی اور پرعزم انداز میں اپنی 'انفرادیت' پر زور دینے کے ساتھ ساتھ ایک فرد اپنے آپ کو اس عظیم تر مجموعے کا حصہ بھی سمجھے جس میں نہ صرف تمام دُنیا کے مرد و زن بلکہ یہ ساری کائنات اور خود الوہیت کی حقیقت بھی شامل ہے۔

اُن کی دو شاہکار فارسی مثنویوں 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بے خودی' کا پیغام بھی یہی ہے کہ انفرادیت (خودی) اُس وقت تک پختہ نہیں ہوسکتی، نہ اُس کی پوری قوت بروئے کار آسکتی ہے جب تک وہ سمندر کے موتی کی طرح انسانیت کے محیط میں ڈوب کر اس کا ایک حصہ نہ بن جائے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی سرسری طور پر اشارہ کر چکا ہوں، انسان جسے عملِ ارتقاء پورا کر کے ایک آفاقی انسان بنتا ہے، اس وسیع و بیکراں کائنات میں کوئی غیر اہم یا حقیر ذرہ نہیں ہے جیسا کہ وہ صدیوں سے سمجھتا آرہا ہے بلکہ وہ اس کائنات کا مرکز اور مفہوم ہے۔ اس کے بغیر یہ کائنات بے معنی ہوتی، اور جہاں تک ہمارا علم ساتھ دیتا ہے، بے جان اور سرد پڑی رہتی اگر اُسے انسان کی ذہانت، سمجھ بوجھ اور محبت نے زندگی کی یہ ہمک نہ بخش دی ہوتی۔ یہی انسان کا مقصد اعلیٰ ہے، وہ قدریں ہیں اور اس بے جان کائنات کو اہمیت اور رنگ و آہنگ عطا کرتی ہیں۔ بظاہر یہ بہت بلند بانگ دعویٰ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری کائنات اپنے تمام نظام ہائے شمسی، کھربوں ستاروں اور بے شمار انواع حیات کے ساتھ انسانی زندگی کے ڈرامے کا صرف پس منظر ہیں۔ لیکن تمام لامتناہی بحثوں کے باوجود جواب تک اس موضوع پر ہوتی رہی ہیں، بھی بڑے مذاہب کا یہی نقطۂ نظر رہا ہے۔

Marfat.com

انسان فضائے کائنات میں تحلیل ہو جانے والا کوئی شرارہ نہیں ہے بلکہ اس کی زندگی اس مقصد تکوین کا ایک حصہ ہے جسے مذاہب کی اصطلاح میں 'حکمتِ الٰہیہ' کہا جاتا ہے۔ اس دُنیا میں انسان کے اعمال بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ہمارے پیغمبر ﷺ اس عظیم نظام اور ضابطے کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے جو کائنات میں نظر آ رہا ہے اور جسے وہ محض 'اتفاقات' کا حیرت انگیز کرشمہ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ آپ قرآن کے لفظوں میں بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں:

''ربنا ما خلقت هذا باطلا۔''

(اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے۔)

اور درحقیقت یہی وہ نقطۂ نظر ہے جو اسلام پیش کرتا ہے:

''اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو، مجھ کو بنانا ہے زمین میں ایک نائب۔ بولے: کیا تو رکھے گا اُس میں جو شخص فساد کرے وہاں اور کرے خون۔ اور ہم پڑھتے ہیں تیری خوبیاں اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو۔ کہا مجھ کو معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔''
(البقرۃ:۳۰)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب خدا نے اپنے ارادے کا اعلان کیا کہ وہ انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنائے گا تو اس کے فرماں بردار فرشتوں نے اس فیصلے کے خلاف دبے لفظوں میں احتجاج کیا اور کہا کہ انسان زمین پر خون بہائے گا اور فساد برپا کرے گا جو اُسے وراثت میں ملا ہے۔ اس پر ارشادِ باری ہوا: ''انی اعلم ما لاتعلمون'' (میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) یعنی وہ ایسا کر تو ضرور سکتا ہے کیونکہ اُسے خیر و شر میں تمیز کا اختیار دیا جائے گا مگر اس میں یہ بھی صلاحیت ہے کہ وہ ساری کائنات کو حسن اور خیر سے بھر دے، اس میں معنویت پیدا کر دیا اور اس طرح زمین پر خدا کے مقاصد کی تکمیل میں معاون ثابت ہو۔ اپنی ایک خوبصورت نظم میں جس کا عنوان 'میلادِ آدم' ہے۔ اقبال نے کائنات میں انسان کے رول کے اس عظیم ڈرامے کو اس طرح پیش کیا ہے اور یہ قرآن کے مجموعی اندازِ فکر سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔

Marfat.com

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فطرتِ آشفت کہ از خاکِ جہاں مجبور
خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد

خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل
حذرائے پردگیان، پردہ درے پیدا شد

آرزو بے خبر از خویش بہ آغوشِ حیات
چشم و اکرد و جہانِ دگرے پیدا شد

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عصر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

اس طرح انسان عالمِ ناسوت و لاہوت دونوں میں شریک ہو جاتا ہے۔ ایک طرف وہ تمام مخلوقات میں شامل ہے جن میں عالمِ نباتات بھی ہے، جسے ابھی کچھ زمانہ پہلے تک بے جان مانا جاتا تھا۔ دوسری طرف وہ عالمِ ملکوت کو پانے کا خواہش مند ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے خمیر میں شیطنت اور ملکوتیت کا حیرت انگیز امتزاج بھی ہے یعنی ایک طرف تخلیق و تعمیر کی قوتیں ہیں تو دوسری جانب تخریب و فساد کی۔ ورثے میں ملے ہوئے یہ تضادات ہی کائنات میں اُس کے ڈرامائی رول کا تعین کرتے ہیں اور یہی اس کی زندگی کے کامیاب یا المناک ہونے کا راز ہیں اور اسی راز کو سمجھنے سے فرشتے قاصر رہے تھے۔ قرآن کے الفاظ میں:

> ''ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اُٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اُٹھا لیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔''
>
> (الاحزاب، ۷۲:۳۳)

اس کے ساتھ ہی قرآن نے انسان کی دورُخی تقدیر کی جانب ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

> ''ہم نے بنایا آدمی خوب سے خوب اندازے پر، پھر پھینک دیا اُس کو نیچوں سے نیچے مگر جو یقین لائے اور کیں بھلائیاں سو اُن کو

Marfat.com

نیگ ہے بے انتہا۔'' (۹۵:۴-۵)

بالفاظِ دیگر وہ اعلیٰ ترین بلندیوں تک پرواز کرسکتا ہے کیونکہ اللہ نے اُسے 'احسن تقویم' سے پیدا کیا ہے اور دوسری طرف 'اسفلِ سافلین' میں بھی گرسکتا ہے، اگر وہ اپنے اس اختیارِ تمیزی کا استعمال نہ کرے جو اُسے خیر کو فروغ دینے کے لیے عطا کیا گیا ہے۔ چاہے اُس کا اظہار نیکی کے محدود مفہوم میں ہو یا اُن وسیع تر معنوں میں جن میں صداقت، حسن اور محبت بھی شامل ہیں اور جسے کورنتھی مناجات میں 'عظیم ترین' کہا گیا ہے۔ انسانی فطرت کی اس دورُخی کو بہت سے بالغ نظر مفکروں اور مصنفوں نے پہچانا ہے:

> ''اعمالِ انسانی کا ایک بڑا حصہ خوبصورتی کو مسخ کرنے، صداقت کو خورد برد کرنے، انصاف کو ناکام اور خیر کو بے راہ بنانے پر منتج ہوتا ہے۔ الوہی صفات رکھنے والی اس مخلوق میں ایک شیطان بھی چھپا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے انسان کی زندگی اپنی تمام الوہی صفات کے باوجود اعمال و افکار میں دائمی تضادات کا شکار ہے۔''

مذہب کا کام ایک طرف تو ان تضادات کو دُور کر کے انسان کو اوپر اُٹھانا ہے اور دوسری طرف اس آفاقی انسان کی نشوونما کو فروغ دینا ہے جو اس قید خانے کی اُن دیواروں کو توڑ سکتا ہے جو اس کی روح کا تابوت بن گئی ہیں۔ تب کہیں جا کر وہ حقیقی انسانی آزادی کی صبح میں آنکھیں کھول سکے گا، جہاں تمام انسان ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں کی طرح برتاؤ کریں اور آپس میں ہمدردی، رفاقت اور مصنفانہ برتاؤ کے ساتھ بسر کرسکیں۔ مذہب اس مقصد کو صرف اس طرح حاصل کرنا نہیں چاہتا کہ ان صفات کے پسندیدہ ہونے کی تبلیغ کو کافی سمجھ لے، اتنا تو بسا اوقات فلسفی، سیاسی مفکرین یا خیال پرست مصنّفین بھی کرتے رہتے ہیں۔ مذہب نے اپنے بانیوں اور بعض برگزیدہ پیروکاروں کی زندگی میں نئے انداز کی شخصیت کا مثالی نمونہ بھی پیش کیا ہے۔ یہ لوگ کسی حد تک زمان و مکان کی قیود سے ماورا ہیں جن میں اُن کے معاصرین زندہ تھے، کام کرتے اور سوچتے تھے یا اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ ایسی مثالی شخصیات کا اثر

Marfat.com

صرف لفظوں میں بیان کیے ہوئے خیالات سے کہیں زیادہ گہرا اور پائیدار ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو اس کی بدولت نا قابل یقین تیزی کے ساتھ پورے عہد کا مزاج بدل جاتا ہے۔ اگر بنی نوع انسان میں انقلابی تبدیلیاں لانے کے لیے صرف خیالات ہی کافی ہوا کرتے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بعض غیر مذہبی مفکرین نے بھی اتنے ہی گہرے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مگر یہ ثابت کرنا مشکل ہوگا کہ اول الذکر طبقے کی اخلاقی گرفت بھی مذہبی رہنماؤں کے اثر کی طرح مضبوط اور دیرپا رہی ہے۔ دُنیا میں انقلابی تبدیلیاں لانا صرف اُس وقت ممکن ہوتا ہے جب خیالات، اقدار، ایقان اور نا قابلِ شکست عقیدہ کسی کی شخصیت میں رچ بس جاتے ہیں اور اس کی زندگی دائمی طور پر اس سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔

مہاتما بدھ، عیسیٰ مسیح، کرشن جی اور حضرت محمد ﷺ آفاقی انسانوں کے اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ حضرات اب ہندی یا فلسطینی، عربی، کالے، سرخ یا گورے نہیں ہیں۔ یہ اپنے اپنے انداز کی 'حقیقی شخصیت' بن چکے ہیں اور نہ صرف اپنے عصر حاضر کے پیروکاروں کو، بلکہ نا آفریدہ نسلوں کو بھی ترغیب دے رہے ہیں اور وہ بھی اپنی اپنی روایت کی زنجیریں توڑ کر ایسی ہی 'شخصیت' بنالیں اور یوں اُس تاب ناک منزل کی طرف قدم بڑھاتے رہیں جو ابھی تک خاصی دُور نظر آتی ہے۔ یہ پیش قدمی انہیں اپنی بہت سی انجانی صلاحیتوں کا احساس کرنے کے قابل بناتی ہے۔ جب رسولِ اکرم ﷺ کی مثالی شخصیت اور آپ کا اسوۂ حسنہ لوگوں کے باطن کی نگاہوں کے سامنے جلوہ افروز ہوتا ہے تو وہ اپنے حقیر اور ناپائیدار مقاصد اور تمناؤں کو بھول جاتے ہیں جو اب تک ان کی زندگی کا مرکز بنی ہوئی تھیں اور اس دشوار گزار اور سختیوں سے بھرپور راستے کو ترجیح دینے لگ جاتے ہیں جس کی طرف پیغمبر ﷺ کی آواز اور آپ کی اپنی مثال بلا رہی ہے۔ یہی اُن بہت سے لوگوں کے ساتھ بھی ہوا ہے جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی سنت کا اتباع کیا۔ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں اُن حیرت انگیز تبدیلیوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو ایسے حضرات کی زندگیوں میں رونما ہوئیں۔

درحقیقت زمانے کا بے رحمانہ برتاؤ اور مخالف قوتیں اس ضیا پاش تصور کو دھندلا کر

Marfat.com

دیتی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کارنامہ غیر متعلق اُمور میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں وہ لوگ بھی جو خاص طور سے مذہبی اقدار کے تحفظ کے لیے خود کو وقف کر دیتے ہیں، ظاہر کو باطن پر ترجیح دینے لگتے ہیں۔ یہ انسانی زندگی کا وہ المیہ ہے جو ہمیشہ دہرایا جاتا رہا ہے لیکن اس سے پیدا ہونے والی قوتِ محرکہ نہ صرف اس مذہب کے پیروؤں کی تہذیب اور نظامِ سیرت میں نفوذ کر جاتی ہے بلکہ وہ پوری انسانی میراث کا ایک حصہ اور کبھی کبھی شعوری طور پر محسوس نہ ہو سکنے والا سرمایہ بن جاتی ہے اور انسان کی ایک بڑی جماعت کو براہِ راست یا بالواسطہ متاثر کرتی رہتی ہے۔

اب ہمیں آفاقی انسان کے اس تصور کی بازیافت کرنا ہے جسے اسلام پیش کرتا ہے اور جو غیر مذہبی اور ادبی سرمایے میں بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں اس فریب سے بچنا بہت ضروری ہے کہ یہ نظریہ تنہا اسلام ہی کی ملکیت ہے اور کسی دوسرے مذہب نے اس طرح کا تصور کسی دوسرے انداز یا درجے میں پیش نہیں کیا ہے، یا جو بات اس سے بھی زیادہ گمراہ کن ہو سکتی ہے وہ یہ کہ اس سے 'حقیقی مسلمان' مراد ہے۔ یہ تو صرف تخیل پر مبنی ایک تمثیل ہے کہ کوئی شخص آفاقی انسان کا لباس زیبِ تن کر کے ایک اچھا انسان کیسے بن سکتا ہے اور یہ وہ مقصود ہے کہ جس کی طرف ہر مسلمان بلکہ ہر انسان کو پورے خلوص کے ساتھ جدوجہد کرنی چاہیے۔ اسلام نے اس ارتقاء کے لیے کام بھی کیا ہے اور جدوجہد بھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلام ایک آفاقی مذہب ہونے کا دعوے دار ہے اور اس لحاظ سے وہ ایک ایسا مذہب ہے جو دوسرے ادیان اور اُن کے بانیوں میں بھی صداقت کے عنصر کو تسلیم کرتا ہے اور اس صداقت کو اپنے اندر جذب بھی کرتا ہے۔ اس نے اپنے تصور کو لازماً کسی قوم یا نسل یا جغرافیائی علاقے کے ساتھ محدود نہیں کیا ہے۔ اس لیے وہ اپنے مثالی انسان میں بھی اس نظریے کا عکس دیکھنا پسند کرے گا۔

سب سے پہلے تو یہ آفاقی انسان تسلیم ہی نہیں کرتا کہ فروعی اختلافات اور حد بندیاں جن میں ہم الجھے ہوئے ہیں، کوئی وقعت رکھتی ہیں کیونکہ یہ انسانی وفاداری اور خیر سگالی کے اس کے وسیع تصورات سے ٹکراتی ہیں۔ اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ تمام انسانوں کے ساتھ

Marfat.com

یکساں برتاؤ کرے گا اور غیر مسلموں سے بھی برتاؤ کرنے یا ان کو پرکھنے کے لیے ایک ہی معیار استعمال کرے گا۔ یہ نہیں کہ 'اپنوں' کو جانچنے کے لیے کسوٹی کچھ ہو اور دوسروں کو آنکنے کی کچھ اور:

''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو، اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ دیکھتا اور سُنتا ہے۔'' (النساء:۵۸)

اسے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ سب انسانوں (الناس = بنی نوع انسان) سے منصفانہ سلوک کرے۔ خوش معاملگی صرف وہ نہیں ہے جو اپنے ہم مذہبوں سے کی جائے۔ کسی بھی طرح کے حالات میں کسی سے بھی ناانصافی کرنے کا جواز نہیں، خواہ وہ بدترین دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ ''الناس امة واحدة'' (۲:۲۱۳) تمام انسان ایک ہی امت ہیں اور جو اختلافات اُنہیں گروہوں میں بانٹ دیتے ہیں وہ یا تو اتفاقی ہیں یا پھر اس لیے ہیں کہ اس اختلاف سے وہ پہچانے جاسکیں:

''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔'' (الحجرات:۱۳)

دوسرے موقع پر یہ کہا گیا ہے کہ انسان نہ صرف اپنے والدین اور رشتے داروں کے ساتھ احسان (نیکی، مہربانی، تکریم) کا برتاؤ کرے بلکہ دوسرے یتیموں، ضرورت مندوں، محتاجوں اور ہمسایوں کے بھی کام آئے خواہ ان سے کوئی رشتہ ہو یا نہ ہو۔ (سورۂ بنی اسرائیل:۲۴ تا ۲۷)۔ اس فرمان کی تائیدِ مزید ایک حدیث سے ہوتی ہے:

''مومن وہ ہے جو کسی کے ساتھ دھوکا دھڑی نہیں کرتا۔ بلکہ

Marfat.com

سچا مومن (یعنی سچے عقیدے والا جس کا مرتبہ رسمی 'مسلم' سے برتر ہے)
وہ ہے جو اپنے ہمسایے سے دغا نہ کرے اور جس سے وہ خود کو مامون
سمجھیں۔''

یہاں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی امتیاز نہیں کیا گیا ہے بلکہ کہا گیا ہے کہ اس کے تمام ہمسایے اس سے مطمئن اور مامون ہوں اور انہیں یہ اندیشہ بھی نہ ہو کہ اس سے انہیں کوئی شر پہنچے گا۔ اس طرح ساری کائنات ایک دوسرے پر انحصار کرنے کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ہمسایہ بن جاتی ہے اور جو لوگ ہم سے دُور بھی بستے ہیں وہ بھی ہمارے پڑوسی کہے جا سکتے ہیں۔ اسلام اگر صحیح معنوں میں کسی شخص کی زندگی پر اثر انداز ہو جائے، جو افسوس ہے کہ آج نہیں ہے، تو اس کے برتاؤ اور نظریات میں ایک انقلابی تبدیلی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر اسلام کا بنیادی پیغام تمام انسانوں کی زندگی میں سرایت کر جائے، یا کم از کم ایک قابلِ لحاظ تعداد کو متاثر کر دے تو اسے بالکل نئی شان و شوکت مل سکتی ہے کیونکہ بہرحال بنی نوع انسان کے مصائب اور مشکلات کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم دوسرے لوگوں کے ساتھ وہ اچھا اور منصفانہ برتاؤ کرنے میں ناکام رہے ہیں جو اُن کا حق ہے۔ یہی وہ بات ہے جو انسان کی 'کلیت' کو اخلاقی اور سماجی اعتبار سے بٹے ہوئے انسان سے نمایاں طور پر جدا کر دیتی ہے۔ یہ صرف افراد کے لیے ہی ضروری نہیں بلکہ قومی رشتوں پر بھی صادق آتا ہے اور یہ ایک ایسا ضروری حکم ہے جس میں کوئی رعایت نہیں ہو سکتی۔

''ایک گروہ نے جو تمہارے لیے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا
ہے اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے
مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔ جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں
اُن میں سب سے تعاون کرو۔ اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان
میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو۔ اس کی سزا بہت سخت ہے۔''
(المائدہ:۲)

Marfat.com

کسی کو دوسرے شخص یا قوم کے ساتھ اس بنا پر غیر منصفانہ برتاؤ کرنے کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اس کا دشمن ہے خواہ اس نے مسلمان کو کعبے میں داخل ہونے سے روکا ہی کیوں نہ ہو۔ ہمارا فرض ہے کہ خیر کے ہر کام میں تعاون کریں، چاہے وہ مسلمان سے سرزد ہو یا غیر مسلم سے اور جس بات میں شر کا پہلو ہو خواہ وہ کسی سے بھی سرزد ہو رہی ہو اُس سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔ مندرجہ ذیل آیت میں یہی اصول بیان ہوا ہے:

> "کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو۔ یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔" (المائدہ:۸)

یہ آیت ہمیں حکم دیتی ہے کہ ہم حق کے لیے ایک جری گواہ بن جائیں اور کوئی اس راہ سے ہمارے قدم نہ ڈگا سکے اور انصاف کرنے کے معاملے میں ذاتی دوستی یا دشمنی کا خیال بالائے طاق رکھ دیں۔ خواہ ہم منصف ہوں یا گواہ، تمام معاملات میں ہمارے کردار کا رہنما اصول یہی ہونا چاہیے۔ اس سے بھی یہ مستنبط ہوتا ہے کہ قومیت کا جو تصور عہدِ حاضر کے ذہن پر گزشتہ دو صدیوں سے قبضہ جمائے ہوئے ہے شاید تمام خوبیوں کا جامع نہیں ہے۔

اس آفاقی انسان میں اتنی ہمت ہونی چاہیے کہ دُنیا کی کسی بھی تہذیب میں یا کسی بھی خطے میں نیکی کے حصول کے لیے پہنچ جائے۔ ایک مشہور حدیث کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الحکمۃ ضالۃ المومن فلیأ خذھا اینما وجدھا۔

(دانائی مومن کی متاعِ گمشدہ ہے جہاں بھی اسے پائے، اپنا لے۔)

اس کی ہمدردی، اثر پذیری اور اخذ و تاثیر کی صلاحیت پر کوئی حد بندی نہیں ہے۔ یہی ایک فرد کی حیثیت سے اُس کے ذی استعداد ہونے کی نشانی ہے اور دوسری قوموں یا تہذیبوں کی قدر کرنے کی بنیاد بھی صحیح معنوں میں یہی ہے۔ ایک بار یہ روشنی اسے نظر آ جائے تو پھر کسی

Marfat.com

خوف یا مصلحت سے وہ اسے چھپاتا نہیں بلکہ کھلے دل سے اس میں حصہ لینے کے لیے ساتھیوں اور گھر بار سمیت میدان میں آ جاتا ہے اور یہ پروا نہیں کرتا کہ اس میں اُس کا انجام کیا ہوگا۔ یہی وہ بات ہے جس کا مطالبہ خدا نے تمام انبیائے سابقین سے بھی کیا تھا اور ہمارے پیغمبر ﷺ سے بھی یہی ارشاد ہوا تھا:

''اے پیغمبرؐ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔ اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے، یقین رکھو وہ کافروں کو کامیابی کی راہ ہرگز نہ دکھائے گا۔'' (المائدہ:۶۷)

پیغمبر ایک عظیم الشان آفاقی انسان ہوتا ہے خواہ وہ یہ بات جانتا ہو یا نہ جانتا ہو اور وہ اس کا دعویٰ کرتا ہو یا نہ کرتا ہو۔ وہ اپنے اطراف کے جغرافیائی اور تاریخی حالات میں محصور ہو سکتا ہے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے فرمایا: ''مجھے اللہ نے صرف بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا ہے۔'' شویٹزر (Schweitzer) نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''یہ خیال ایک ایسے مقامیت زدہ اور بخود مرتکز کلچر کی پیداوار ہے جس کے ذہن پر ایک مسیح کی وساطت سے قومی نجات پانے کا خیال چھایا ہوا تھا۔'' مگر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جو سچائیاں اُنہوں نے پیش کیں اور جن قدروں کی حمایت کی، اُن کا دائرۂ اثر بہت وسیع تھا۔ خود مسیح نے اپنے دل میں کسی خاص گروہ سے کسی طرح کی برأت کے احساس کو پرورش نہیں کیا تھا اور قرآن نے تو بالکل ہی غیر مبہم لفظوں میں اعلان کر دیا تھا:

''اے رسول! کہہ دو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف (بھیجا ہوا) اس خدا کے نبی ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے۔'' (الاعراف:۱۵۸)

اور ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوا:

''(اے رسول) اور ہم نے تمہیں نہیں بھیجا مگر تمام عالموں

Marfat.com

کے لیے رحمت بنا کر۔'' (الانبیاء:۱۰۷)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسول کا پیغام کا جسے قرآن 'دین' کی اصطلاح میں یاد کرتا ہے، تخاطب کسی خاص گروپ یا علاقے یا ملک کی طرف نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان سے ہے۔ چونکہ خدا ساری کائنات کا حاکم ہے، اس لیے ظاہر ہے اس کا وہ پیغام بھی جو رسول پر وحی کیا گیا سب کے لیے ایک ہی ہونا چاہیے۔ آفاقی انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اپنے اندر حق کی وکالت کرنے کی جرأت پیدا کرے اور بسم اللہ کے گنبد میں بند رہ کر عافیت جوئی کی عادت کو چھوڑ دے اور اس وحشی دُنیا کے کارزار میں کود پڑنے کے لیے خود کو آمادہ کرے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، اسلام نے دوسرے تمام مذاہب، ان کے رہنماؤں اور عبادت گاہوں کے لیے احترام کا اظہار کرنا مسلمان کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ اگر کوئی مسلمان ایسا نہیں کرتا تو گویا وہ اپنے عقیدے کے ایک بنیادی اصول کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے اور اسے اپنے طریقِ عمل کے لیے قرآن یا اسوۂ رسول سے کوئی جواز نہیں مل سکے گا۔ یہ صحیح ہے کہ تاریخ میں کچھ ایسے بھی مسلم بادشاہ یا دوسرے صاحبانِ اقتدار گزرے ہیں جنہوں نے ایسے احترام کا مظاہرہ نہیں کیا، لیکن وہ اپنے اعمال کے لیے خود ذمہ دار ہیں جس طرح دوسرے مذاہب کے پیرو اگر ایسا توہین کا رویہ اختیار کریں تو یہ ان کا انفرادی عمل سمجھا جائے گا۔ قرآن کا اس سلسلے میں واضح فرمان یہ ہے:

> ''اور یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں، انہیں گالیاں مت دو ورنہ کہیں یہ بھی حد سے تجاوز کر کے اپنی جہالت کی وجہ سے اللہ کو گالیاں نہ دینے لگیں۔ ہم نے اسی طرح ہر جماعت کے لیے اس کے عمل کو زینت بنا دیا ہے، پھر انہیں اپنے رب کی طرف ہی لوٹنا ہے، اس وقت وہ انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔'' (الانعام،۶:۱۰۹)

اسلام یہ مانتا ہے کہ تمام بڑے مذاہب حصولِ حق کی دلالت کرتے ہیں اور اُن

Marfat.com

مذاہب کے بانیوں نے ان کے مختلف پہلو دکھائے ہیں۔ اس لیے اُن کے درمیان کوئی معاندانہ تفریق نہیں کی جانی چاہیے۔ کسی دوسرے مذہب نے ایسی تاکید اور تکرار کے ساتھ اس انقلابی سچائی کا اعلان کبھی نہیں کیا مگر قرآن میں ایسی متعدد آیات موجود ہیں جو احترام کو اسلام کے عقیدے کا جزو لاینفک بنا کر پیش کرتی ہیں۔

''اے مسلمانو! کہو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب کی طرف سے نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰ اور تمام پیغمبروں کو اُن کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم اُن کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔'' (البقرۃ،۲:۱۳۶)

یہ حکم بیک وقت مثبت بھی ہے اور منفی بھی۔

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے مابین تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ سب پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کے لیے ہم نے وہ سزا مہیا کر رکھی ہے جو انہیں ذلیل و خوار کر دینے والی ہوگی۔ بخلاف اس کے جو لوگ اللہ اور اس کے تمام رسولوں کو مانیں اور اُن کے درمیان تفریق نہ کریں، اُن کو ہم ضرور ان کے اجر عطا کریں گے اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

(النساء،۴:۱۵۰)

امن و آشتی کا مذہب:

اسلام انبیاء کے درمیان ہر طرح کی تفریق کی مخالفت کرتا ہے۔ جب آپ ایک نبی پر ایمان لائے ہیں تو لامحالہ دوسرے انبیاء پر بھی ایمان لانا ہوگا کیونکہ وہ سب ایک ہی روحانی

Marfat.com

...چشمہ سے فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح نجات کسی ایک خاص مذہب کی اجارہ داری نہیں رہتی۔ گویا دوسرے بالکل ہی تاریکی میں ہوں، خواہ ان کے اعمال کیسے بھی ہوں۔ حیاتِ صالحہ کی تعمیر کے لیے عقیدہ و عمل دونوں عنصر اہم ہیں۔ عقیدہ تو اس لیے اہم ہے کہ انسانی تجربات کے کچھ ایسے دائرے ہیں جنہیں سائنس یا نری منطق کی روشنی سے جگمگایا نہیں جا سکتا۔ اور کم از کم بہت بڑی اکثریت کی زندگی میں عقیدہ سخت بحران کے ایسے نازک لمحوں میں سہارا دیتا ہے اور دست گیری کرتا ہے جب اس کا اندیشہ ہوتا ہے کہ قالب اتنا ناتواں ہو چکا ہے کہ روح بھی کھسکنے لگے گی۔ بعض فی الواقع ممتاز شخصیات کی زندگی میں بھی، جو مذہب میں عقیدہ رکھنے یا کسی فوق الفطرت ہستی کو ماننے کی ضرورت کے منکر تھے، کچھ ایسے لمحے آئے ہیں جنہیں 'روحانی تجربات' ہی کہا جا سکتا ہے اور اُن کی کوئی دوسری تاویل نہیں ہو سکتی۔ اُردو کے عظیم شاعر حالی نے اپنی رباعیات میں اسی بات کو ملحدوں اور لاادریوں میں بھی غیر شعوری طور پر انسان سے بالا و برتر کسی ہستی کے احساس سے تعبیر کیا ہے۔

ہندو نے صنم میں پایا جلوہ تیرا — آتش پہ مغاں نے گیت گایا تیرا
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا — دہری نے کیا دہر سے تجھ کو تعبیر

برٹرینڈ رسل نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں کچھ ایسے عجیب و غریب روحانی تجربات کا ذکر کیا ہے جن کے غیر معمولی اثرات کو الفاظ میں لانا مشکل ہے۔ ایک بار اسے اچانک یہ محسوس ہوا کہ اس کی شخصیت اور ساری کائنات کے درمیان دوئی کا احساس بالکل ختم ہو گیا ہے۔ زندگی ایک مکمل اکائی ہے اور سارے اعتبارات محض توہم ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے سائنس یا منطق یا ریاضی ثابت کر سکتی ہے۔ یہ تجربہ مذہب، عقیدے اور وجدان کی دُنیا سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، اعمال بھی اتنے ہی ضروری ہیں۔ بلکہ یہ کہنے کی جرأت کی جا سکتی ہے کہ اس سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ اکثر لوگ عقیدے کو پکڑ لیتے ہیں کیونکہ یہ ظاہری اعتبار سے نسبتاً آسان ہے۔ آپ کچھ الفاظ یا قواعد کو مانتے یا بار بار دہراتے ہیں بلکہ

Marfat.com

عبادت کی کچھ بندھے ٹکے رسوم و ظواہر ادا کر دیتے ہیں تو آپ کسی خاص مذہب میں داخل ہو جاتے ہیں، گویا 'عقیدہ' بھی فی الاصل ظواہر مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر اعمال کا معاملہ دوسرا ہے۔ یہ تو وہ چیز ہے جسے آپ کو ساری زندگی کرنا ہے۔ روزانہ اور زندگی کے ہر لمحے میں--- گویا آپ کو خدا کی حضوری کے انوار میں رہنا ہے جو کہتا ہے:

نحن اقرب الیہ من حبل الورید۔

(میں اُن کی شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہوں۔)

یہ کسی شخص کے کردار اور مذہبی اقدار میں اس کے عقیدے کی استواری کو جانچنے کا زیادہ صحیح پیمانہ ہے اور یہی سبب ہے کہ لوگوں کی اکثریت اس معیار پر پوری نہیں اُترتی اور یہاں سے یہ رسمِ عام نکلتی ہے کہ لوگ کسی خاص مذہب کے ظواہر سے باضابطہ الحاق کو نجات یا مکتی کا دروازہ سمجھنے لگے ہیں اور اس کے دوسرے تمام عملی مضمرات کی طرف نسبتاً کم توجہ دیتے ہیں۔

میری رائے میں یہ عیسائیت کی غلط ترجمانی کی گئی کہ عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ کسی پادری کے سامنے اعترافِ گناہ کر لینا کسی شخص کے تمام گناہ اور زیادتیاں بخشوا دیتا ہے یا حضرت مسیح نے مصلوب ہو کر عیسائیوں کے تمام گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے یا کوئی شخص خواہ زندگی بھر کچھ بھی کرتا رہے اس کی نجات کبھی ہرگز نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ 'عشائے ربانی' کی آخری رسم ادا نہ کی گئی ہو۔ دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی اسی طرح کی ترغیبات کا شکار ہو گئے ہیں۔

بہت سے مسلمان غلط طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ نہ صرف نجات، اسلام کے پیروکاروں کے لیے مخصوص ہے بلکہ اسلام کے بعض وہ مخصوص فرقے بھی ناجی ہیں جن سے ان کا اپنا تعلق ہے، اسی طرح دوسروں کا خیال ہے کہ چونکہ کسی بڑے روحانی پیشوا نے مرتبۂ شہادت حاصل کر لیا ہے، اس لیے ان کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا ہے اور انہیں یومِ حساب کے لیے خواہ مخواہ پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ صوفیا کے بعض مکاتب یہ سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے کے بانیوںؒ کی شفاعت کے وسیلے اور کچھ رسومِ ظاہری ادا کرنے سے انسان کو نجات مل جائے گی۔

اسلام کے نزدیک ان میں سے کسی نظریے کی بھی کوئی وقعت نہیں۔ اسلام کا نظریہ تو

Marfat.com

یہ ہے کہ خدا کے قانونِ نجات میں کوئی قومی یا مذہبی تفرقہ بندی نہیں ہے اور نہ اس میں خاندانی فخر کام آتا ہے۔ وہ تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ انسان کا عقیدہ کیا ہے اور اس کے اعمال کیسے ہیں؟ وہ عیسائیوں اور یہودیوں کے اس دعوے پر فہمائش کرتا ہے کہ وہ خدا کے محبوب بندے ہیں اور خاص طور پر اس کے منظورِ نظر ہیں اور انہیں اپنے گناہوں کی پاداش نہیں ملے گی یا ملے گی تو بہت ہلکی۔

وقالت الیھود و النصریٰ نحن ابنٰوا اللہ و احبآؤہ قل فلم یعذبکم بذنوبکم بل انتم بشر ممن خلق یغفر لمن یشاء و یعذب من یشاء و للہ ملک السمٰوٰت والارض وما بینھما والیہ المصیر۔ (المائدہ، ۵:۱۸)

(اور کہتے ہیں یہود و نصاریٰ کہ ہم بیٹے ہیں اللہ کے اور اس کے پیارے۔ تو پھر کیوں عذاب کرتا ہے تم کو تمہارے گناہوں پر، کوئی نہیں بلکہ تم بھی ایک آدمی ہو، اس کی مخلوق میں، بخشے جس کو چاہے اور عذاب کرے جس کو چاہے اور اللہ ہی کے لیے سلطنت آسمان اور زمین کی اور جو کچھ دونوں کے بیچ میں ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔) (ترجمہ: شیخ الہند)

پھر مسلمان کس طرح یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ خدا کے محبوب بندے ہیں اور اس کا قانون مکافات ان کے لیے کم و بیش بے معنی ہے، حالانکہ کوئی فرقہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس کا تعلق تو اس سے ہے کہ وہ اپنی زندگی کیسے بسر کرتے ہیں۔ کوئی شخص یا فرقہ جو اسے نفاست، استواری اور دلسوزی کے ساتھ بسر کرتا ہے وہ یقیناً اس زندگی میں جزا کا مستحق ہوگا اور آخرت میں بھی۔ مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے اس معاملے میں یکساں ہونے کے نکتے پر بار بار اور غیر مبہم لفظوں میں زور دیا گیا ہے اور اس کے مختلف مضمرات واضح کر دیے گئے ہیں۔ ایک مسلمان سے کہا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ یاد رکھے:

Marfat.com

لیس بامانیکم ولا امانی اهل الکتاب من یعمل سوء یجز به ولا۔ یجدله من دون الله ولیا ولانصیرا ومن یعمل من الصلحت من ذکر او انثی وهو مؤمن فاولئك یدخلون الجنة ولایظلمون نقیرا۔ (۴:۱۲۳-۱۲۴)

(نہ تمہاری اُمیدوں پر مدار ہے اور نہ اہلِ کتاب کی اُمیدوں پر۔ جو کوئی برا کام کرے گا اس کی سزا پاوے گا اور نہ پاوے گا اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار اور جو کوئی کام کرے اچھے، مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان رکھتا ہو سو وہ لوگ داخل ہوں گے جنت میں اور اُن کا حق ضائع نہ ہوگا تل بھر۔) (ترجمہ: شیخ الہند)

یہ تو مسلمانوں (یا دوسرے کسی بھی مذہب کے متبعین) کی ڈھٹائی ہے کہ وہ یہ دعویٰ کریں کہ نجات صرف انہیں کا حق ہے۔ اس کا تعلق اس سے نہیں ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں یا کیا کہتے ہیں۔ کس مرد یا عورت کو جنت میں جگہ ملنی ہے؟ وہ جو صالح عقیدہ اور اعمال رکھتے ہیں۔ اس کے برخلاف جہنم میں کون جائے گا؟ وہ جو برے کام کرتے ہیں اور ہمیشہ ظلم و تعدی کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ اہلِ کتاب میں بھی، جن میں صرف یہود و نصاریٰ ہی نہیں وہ سب قومیں شامل ہیں جن کی طرف خدا نے اپنے لاتعداد برگزیدہ بندے اور اپنے صحائف بھیجے، ایسے لوگ ہیں جو اپنے الفاظ، خیالات و اعمال سے خدا کی رحمتوں کے لیے اپنا استحقاق ثابت کر چکے ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے مذہب کی روح کو گم کر دیا ہے اور اعمالِ صالحہ کا ولولہ کھو چکے ہیں، وہ خدا کے عذاب کے مستحق ہوں گے۔ لہٰذا اس بارے میں کوئی فیصلہ مجموعی طور پر سارے انسانوں کے لیے کر دینا قابلِ اعتراض اور غیر منصفانہ ہے خواہ وہ مسلمانوں کے بارے میں ہو یا غیر مسلموں کے بارے میں:

لیسوا سواء من اهل الکتب امة قائمة یتلون آیت الله اناٰء اللیلِ وهم یسجُدونَ۔ یومِنُون باللهِ والیوم الاخر ویأمرُونَ

Marfat.com

بالمعروف وینھون عن المُنکرِ ویسارعون فی الخیرات و اولئک من الصلحین۔ (آلِ عمران،۳:۱۱۳-۱۱۴)

(وہ سب برابر نہیں۔ اہلِ کتاب میں ایک فرقہ ہے سیدھی راہ پر۔ پڑھتے ہیں آیتیں اللہ کی، راتوں کے وقت اور وہ سجدے کرتے ہیں، ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور حکم کرتے ہیں اچھی بات کا اور منع کرتے ہیں برے کاموں سے اور دوڑتے ہیں نیک کاموں پر اور وہی لوگ نیک بخت ہیں۔)

اس دلیل کی مزید تقویت و تائید کے لیے ایک دوسرے موقع پر قرآن کہتا ہے:

ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصری والصائبین من آمن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحا فلھم اجرھم عند ربھم ولاخوف علیھم ولاھم یحزنون۔ (البقرۃ،۲:۶۲)

(بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صائبین۔ جو ایمان لایا (ان میں سے) اللہ پر اور روزِ قیامت پر اور کام کیے نیک تو اُن کے لیے ان کا ثواب، اُن کے رب کے پاس اور نہیں اُن پر کچھ خوف اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔)

یہ بات خاصی آگے تک جاتی ہے، اس سے کہیں زیادہ آگے جہاں تک ایک اوسط درجے کا مسلم یا غیر مسلم اپنی رواداری اور دوسرے مذاہب کے احترام میں جانے کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔ لیکن اسلام اسی سے مطمئن نہیں ہوتا، اس سے بھی آگے جاتا ہے اور تمام بنی نوع انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے اختلافات بھول جائیں اور مذہب کے نام پر لڑنا بند کر دیں اور بنیادی سچائیوں پر اتفاق کر لیں جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں اور اس کی روشنی میں اپنے باہمی تعلقات کی تشکیل کریں۔ یہ عالمی سطح پر امن و آشتی کی دعوت ہے۔ اور جنگ و پیکار کی نفی ہے۔ یہ اوّلین مذاہب میں سچائی کے وجود کو تسلیم کرنا ہے اور اس بات کا اعتراف ہے کہ تمام

Marfat.com

انبیاء حق کے معاملے میں ایک دوسرے کے ہمنوا تھے۔

قل یااھل الکتب تعالوا الی کلمۃٍ سوآء بیننا وبینکم الانعبد الا اللّٰہ ولا نُشرِك به سیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله فان تولوا فقولوا اشھدوا ابأنّا مسلمون۔ (آلِ عمران،۳:٦٤)

(تو کہہ دو اے اہلِ کتاب! آؤ ایک بات کی طرف جو برابر ہے ہم میں اور تم میں کہ بندگی نہ کریں ہم مگر اللہ کی اور شریک نہ ٹھہرا دیں اس کا کسی کو اور نہ بناوے کوئی کسی کو رب سوا اللہ کے۔ پھر اگر وہ قبول نہ کریں تو کہہ دو کہ گواہ ہو کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں۔)

اس کا بنیادی مقصد عقیدے کی رسمی تبدیلی نہیں ہے جس کے بارے میں ہم آگے چل کر کچھ بحث کریں گے بلکہ یہ دوسرے مذاہب میں سچائی کے وجود کی توثیق ہے جس کا احترام اور پابندی ان مذاہب کے پیروکاروں کو سیکھنی چاہیے۔

قل یَا أَھلَ الکتبِ لستُم علی شئٍ حتی تقیموا التورۃَ والانجیلَ وَمَا أُنزِلَ الیکم من ربکم۔ (المائدہ،٥:٦٨)

(کہہ دو اے کتاب والو! تم کسی راہ پر نہیں جب تک نہ قائم کرو توریت اور انجیل کو جو تم پر اُترا تمہارے رب کی طرف سے۔)

قرآن ہی یہ بات کہہ سکتا ہے کیونکہ اس کا ایقان ہے کہ صحائفِ آسمانی میں پیش کی ہوئی سچائیاں بنیادی طور پر ایک ہی ہیں اور کسی دوسرے ذریعے سے روشنی حاصل کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے اور ایک سچا مذہبی انسان، جس نے اس بلند تصور کو اچھی طرح جذب واخذ کر لیا ہے، نہ کبھی ایک متشدد مذہبی جنونی کی طرح برتاؤ کر سکتا ہے نہ کبھی مذہبی جبر و تعدی کا آلۂ کار بن سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ انجامِ کار جو چیز دُنیا و آخرت میں زندگی کی حقیقی کامرانی کی طرف رہنمائی کرتی ہے، وہ عقیدہ و عمل کا سچا امتزاج ہی ہوتی ہے۔ یہی وہ جھنڈا ہے جس کے تلے ایک

Marfat.com

آفاقی انسان، جس کا ہم نے تصوراتی خاکہ پیش کیا ہے، زندگی کے جہاد میں شریک ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ انسان اتنی جرأت بھی رکھتا ہے کہ مذہبی عقائد میں غیر مقلد ہو جائے، جب کبھی اچھی اور بھرپور زندگی کی راہیں کھولنے کے لیے عدم تقلید کی ضرورت ہو۔ ہر زمانے میں اور خاص طور سے ہمارے عہد میں خیالات کی اتنی قوتیں اور تحریکیں وجود میں آ چکی ہیں جو زندگی بخش نہیں بلکہ مہلک ہیں، جو روحِ انسانی کے لیے کامرانیوں کے نئے دروازے نہیں کھولتیں، نہ انسانی اخوت کے احساس کو گہرا بناتی ہیں بلکہ اُنہوں نے وہ دروازے بھی بند کر دیے ہیں جو ماضی میں کھولے گئے تھے۔ کوئی شخص بھی سماجی، ثقافتی، سیاسی، اقتصادی اور مذہبی، ہر دائرے میں اس مایوس کن صورت کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا، یہ قوتیں اور تحریکیں انسان کے اس رجحان پر مبنی ہیں کہ وہ اتفاقِ عامہ اور مفادِ عامہ کے پہلوؤں کو دبائے اور اُن کی بے قدری کرے۔

یہ آفاقی انسان جو رنگ و نسل اور ذات پات کی بیڑیوں سے آزاد ہے کبھی ایسے سماجی نظام کی حمایت نہیں کرے گا جو زندگی کی بھلائیوں سے کچھ لوگوں کو محروم کرتا ہو اور دوسروں کو ان سے مستفید ہونے کا موقع دیتا ہو، کیونکہ وہ از راہِ حماقت یہ سمجھتے ہیں کہ یہ صرف انہیں کا اجارہ ہیں۔ وہ ان مفروضات کی بھی نفی کرے گا جن کی بنیاد پر ایسا کوئی نظام یا تہذیب قائم ہو۔ اس کے لیے ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو برادری سے الگ کر لیے اور اس کے غصے اور نفرت کا نشانہ بن جائے اور رضا کارانہ طور پر اپنے لیے تنہائی اور سماجی بائیکاٹ کی زندگی پسند کر لے جیسا کہ بہت سے انبیاء اور دوسرے جرأت مند اور خیر دوست مردوں اور عورتوں کے ساتھ واقعی ہوا ہے۔

> ''کسی حد تک غیر مقلدیت انسانی ارتقاء کے لیے ضروری شرط بھی ہے اور یہی سبب ہے کہ جس زمانے میں یورپ نے کثرت سے غیر مقلدوں کو پیدا کیا، وہ سب سے زیادہ تخلیقی اور نتیجہ خیز دَور تھا جسے اب تک دُنیا نے دیکھا ہے۔'' (ممفورڈ)

Marfat.com

وہ اپنے آباء کی کورانہ تقلید نہیں کرے گا جیسا کہ ہر زمانے میں بہت سے لوگ کرتے رہے ہیں کیونکہ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اس عہد نے یا وقت نے کسی خاص تحریک یا عمل کو کوئی تقدس عطا کر دیا ہے یا یہ ان کی سچائی اور معقولیت کا جواز ہو سکتا ہے۔ اصول تو یہ ہے کہ:

اِن أَحسَنتم أَحسَنتم لأنفسِكم وَإِن أَسَأتم فَلهَا۔ (بنی اسرائیل، ۷:۱۷)

(اگر بھلائی کی تم نے تو بھلا کیا اپنا اور اگر برائی کی تو اپنے آپ سے۔)

ہر فرد اپنے اعمال اور ان کے انجام کا جواب دہ ہے۔ باقی دُنیا کیا کرتی ہے، اس سے لازمی طور پر اسے کوئی رہنمائی نہیں مل سکتی۔ اگر آفاقی انسان کی شخصیت اور کردار کے سلسلے میں اس رویے کی زبردست اہمیت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے خود بہ خود یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ وہ سرتا سر ایک 'امن دوست' انسان ہے۔ اسے معلوم ہوگا کہ جب وہ اپنے ساتھی انسانوں کو مارنے کے لیے ایٹم بم گرائے گا تو وہ درحقیقت یہ عمل اپنے ہی خلاف کر رہا ہوگا اور جب کبھی یا کہیں بھی خطرے کی گھنٹی بجے گی تو وہ درحقیقت اس کے اپنے ہی خلاف بجے گی۔

وہ اس دُنیا میں تشدد، ظلم، استحصال کے عالم گیر پھیلاؤ سے بے حس نہیں رہ سکتا، وہ اُن کا جواز تلاش نہیں کرے گا، محض اس لیے کہ چند افراد یا کوئی فرقہ یا قوم جس میں اس کا اپنا فرقہ یا قوم بھی شامل ہو، اپنی روزمرہ زندگی میں ایسا کر رہی ہے۔ زندگی کی حرمت اور تقدیس پر اس کا گہرا ایمان ہوگا جیسا کہ مہاتما بدھ نے اس کی تبلیغ کی یا جیسے شوئٹزر (Schweitzer) اپنے فلسفے میں بیان کرتا ہے یا جیسے قرآنِ کریم نے غیر مبہم الفاظ میں کہا ہے، صرف یہودیوں کے لیے نہیں جن کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے بلکہ ہر عہد اور ہر عقیدے کے آدمی کے لیے:

مِن اجلِ ذٰلكَ كتبنا عَلى بَنى إسرائيلَ انه من قتل نفسا بغير نفسٍ او فساد فى الارضِ فكانما قتلَ النّاسَ جميعا و من

Marfat.com

احیاھا فکانما احیا الناس جمیعا۔ (المائدہ،۵:۳۲)

(اسی سبب سے لکھا ہم نے بنی اسرائیل پر کہ جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلاعوض جان کے یا بغیر فساد کرنے کے ملک میں تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو اور جس نے زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا زندہ کر دیا سب لوگوں کو۔) (ترجمہ: شیخ الہند)

اس طرح بغیر کسی سبب یا جواز کے ایک شخص کو قتل کرنا ایسا ہی قابلِ مذمت ہے جیسے تمام نسلِ انسانی کا قتل اور ایک شخص کی جان بچانا ساری انسانیت کی جان بچانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ ہم سب ایک دوسرے کے اعضا ہیں اور ہر وہ شخص جو آفاقی انسان کے اس رویے میں شریک ہے، جانتا ہے کہ ہمدردی، بھائی چارہ اور رحم کے جذبات ناقابلِ تقسیم ہوتے ہیں۔ لہٰذا جو کوئی ان سے ایک شخص کو محروم کرتا ہے وہ گویا سب کو محروم کرتا ہے۔ یہ اصول تمام قوموں اور تمام مذاہب کے لیے یکساں اطلاق رکھتا ہے اور اس کے خلاف کوئی مفاہمت نہیں ہوسکتی۔

اسلام اس حد تک نہیں جاتا کہ وہ یہ اعلان کر دے کہ جنگ کرنا ہر طرح کے قابلِ لحاظ حالات میں ممنوع ہے۔ کبھی ظلم کو روکنے کے لیے یا آزادئ فکر پر پابندی کو دُور کرنے کے لیے اس کا جواز بھی ہوسکتا ہے اور یہ اصول بھی اس وقت بنایا گیا تھا جب جنگ نسبتاً معتدل اور مہذب مشغلہ ہوا کرتی تھی۔ اب تو یہ ناقابلِ تصور دہشت بن گئی ہے۔ ایک مکمل جنگ۔

میں نہیں سمجھتا کہ اسلام کی کوئی بھی تاویل خواہ وہ کتنی بھی فراست سے کی جائے ایٹمی جنگ کا جواز پیش کرسکتی ہے، خواہ وہ دفاع میں ہو یا حملہ کرنے کے لیے۔

قرآن نے ہابیل اور قابیل کی تمثیل میں اس طرح کے ذہن و مزاج کا زبردست تضاد بیان کیا ہے۔ جب دونوں بھائیوں میں اختلاف ہوا تو قابیل نے کہا: لاقتلنك (میں تجھے قتل کر دوں گا)۔ یہ ہر دور کے اس ظالم اور قاتل کی آواز ہے جو یہ نہیں سمجھتا کہ وہ اپنے بھائی کا محافظ ہے، خواہ اس کا سگا بھائی ہی ہو۔ ہابیل نے جواب دیا تھا:

قَالَ إنما يَتقبل اللهُ من المتقين لئن بسطتَ اليّ يدَك

Marfat.com

تمنلنی ما ان بباسط یدی الیک لاقتلک انی اخاف الله رب العالمین۔ (المائدہ،۵:۲۷-۲۸)

(وہ بولا! اللہ قبول کرتا ہے تو پرہیزگار سے اگر تو ہاتھ چلاوے گا مجھ پر مارنے کو، میں نہ ہاتھ چلاؤں گا تجھ پر مارنے کو۔ میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو پروردگار ہے سب جہان کا۔) (ترجمہ: شیخ الہند)

یہ ایک آفاقی انسان کے ذہن کا اظہار تھا جس میں زندگی کے لیے احترام ہے، جس میں جارحیت یا اپنے بھائی کے خون سے ہاتھ رنگنے سے انکار ہے، خواہ بظاہر اس کا مقصد اچھا نظر آتا ہو۔ وہ درندوں کی سطح تک نہیں اُتر سکتا کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو وہ اس طرح سے بھی بہت نیچے جا پڑتا ہے کیونکہ اس نے اپنی امتیازی قوت کے عطیے کا استعمال نہیں کیا جو خیر وشر میں تمیز کرنا سکھاتی ہے اور جو خدا کی طرف سے اسے بخشی گئی ہے۔ وہ جغرافیائی انسانی ہے جو دوسرے انسانوں سے الجھ رہا ہے اور ان کے ساتھ درندوں سے بہتر اچھا سلوک کرنے سے قاصر ہے۔ درحقیقت انسان کے سامنے دو راہیں ہیں۔ ایک راستہ انتقام اور طاقت کا ہے، دوسرا معافی اور ضبطِ نفس اور محبت کا۔ قابیل نے پہلا راستہ اختیار کیا اور ہابیل نے دوسرے کو ترجیح دی۔ آفاقی انسان، جیسا کہ قرآن مے اسے پیش کیا ہے، ہابیل کی روایت کا پابند ہوتا ہے۔ پھر وہ صفابت جن کا ایک آفاقی انسان میں پایا جانا ضروری بتاتا ہے، وہی صفات ہیں جن کے پیدا کرنے کے لیے مسلمان، سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر کوئی شخص اس وقت تک سچا مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک اس میں آفاقی انسان کی کچھ جھلک موجود نہ ہو۔ اگر وہ محدود نظریات کا حامل ہے، اگر اسے ذات پات یا فرقے اور قوم کا خیال ہے یا وہ زمین سے بندھا ہوا ہے یا اس کی ہمدردی اور وفاداری اس کی جغرافیائی حدوں میں محدود ہے تو وہ قرآن کی وضاحت کے مطابق ''مسلمان'' نہیں ہوسکتا۔ قرآن نے اس کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ یہ ہیں۔ خالق اور اس کے مقصد تکوین، میں عقیدہ رکھنا، وسیع تر مفہوم ہیں، زندگی کے تمام رشتوں میں نیکی کا برتاؤ کرنا، اپنے کردار میں بدی سے دامن بچانا اور جہاں بھی بدی پائی جائے اس کا قلع قمع

Marfat.com

کرنے کے لیے آمادہ ہونا، انفرادی نیکی یا لازمی اور انفعالی نیکی ہی کافی نہیں ہے بلکہ اسے متعدی اور فعال ہونا چاہیے اور فرد سے باہر سماجی زندگی میں بھی تیزی سے اس کا اثر ظاہر ہونا چاہیے۔ آج ساری دُنیا ایک کنبہ بن چکی ہے، خواہ ایک فرد اپنی ایک چھوٹی سی دُنیا میں ہی سرگرم کار ہو۔

آفاقی انسان خلا میں پیدا نہیں ہوتا۔ نہ ایسے سماج میں جنم لیتا ہے جس کی قدریں اُس کی اقدار سے نمایاں طور پر متضاد ہوں۔ ہاں کچھ مستثنیٰ شخصیات نامساعد ماحول میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اور ایسی شخصیات کی مثالیں بھی موجود ہیں، خاص طور سے انبیاء، اولیاء اور حکماء کے طویل سلسلے۔ مگر یہ شخصیات یہ عام مرد و زن کے فکر اور کردار کو قابلِ لحاظ حد تک متاثر کر سکتیں، جب تک کہ وہ سماجی نظام پیدا نہ ہو جائے جو اسی روش کی حوصلہ افزائی کرنے والا ہو۔

آفاقی انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ نئے سماج کی تدریجی تعمیر میں سرگرمی سے لگ جائے۔ پیغمبر اسے اس نئے آفاقی سماج کی تشکیل کے لیے ترغیب اور ہدایت دے سکتا ہے مگر یہ کبھی بھی قطعی طور پر معرضِ وجود میں نہیں آتا، اسے مسلسل نگرانی اور بنیادی حیات بخش اقدار کی توثیق سے پرورش کیا جاتا ہے۔ کبھی کچھ قدریں جو کسی خاص زمانے سے مختص ہوں فرسودہ ہو جاتی ہیں یا نئے تقاضوں کی روشنی میں اُن کی نئی تعبیر کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس صورتِ حال سے نبٹنے کے لیے اور بھی زیادہ قوتِ ارادی اور قوتِ متخیلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت ضرورت ہے کہ تمام معاشرتی ساختوں، ہر مجوزہ اصلاح، ہر قومی اور مقامی مہم کو اچھی طرح جانچا جائے۔ اس کی ایک ہی کسوٹی ہو سکتی ہے، کیا اس سے آنے والی آفاقی برادری کے قیام میں مدد ملے گی؟

اسلام حالتِ موجودہ کو برقرار رکھنے یا قبول کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ اس عام طور پر رائج تصور کے باوجود کہ وہ تقدیر یا قسمت کے عقیدے کا قائل ہے۔ درحقیقت بعض مغربی مصنفوں کے بقول تمام مشرقی ثقافتیں اور مذاہب اس کے قائل ہیں، مگر اسلام کا حقیقی نظریہ اقبال نے ایک شعر میں بیان کر دیا ہے۔

Marfat.com

گفتند جہان من آیا بتو می سازد   گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

میں جانتا ہوں کہ بہت سے روایتی مفسر ہوئے ہیں اور آج بھی ہیں جو اس تعبیر سے اتفاق نہیں کریں گے کیونکہ وہ ظاہر پرستی میں یقین رکھتے ہیں۔ مجھے ان سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تفسیر و تعبیر کا یہ بے لوچ پن اسلام کی مکمل روح اور نظریۂ کائنات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس اسلامی سماج کا بنیادی نقطۂ آغاز قرآن کی اس آیت میں بیان ہوا ہے اور اس کی تفصیل متعدد مواقع پر دوسری آیات میں بیان ہوئی ہے۔

كنتم خير امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتومنون بالله ولو امن اهل الكتب لكان خيرا لهم منهم المؤمنون واكثرهم الفاسقون۔ (آلِ عمران،۳:۱۱۰)

(تم ہوتو بہتر سب امتوں سے جو بھیجی گئیں عالم میں۔ حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو برے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر اور اگر ایمان لاتے اہلِ کتاب تو ان کے لیے بہتر تھا کچھ تو ان میں سے ہیں ایمان پر اور اکثر ان میں نافرمان ہیں۔)

اجتماعی مقصد جو امتِ مسلمہ کے سامنے ہے، یہ نہیں ہے کہ وہ دُنیا کی سب سے طاقتور قوم یا اعلیٰ ترین نسل بن جائے جیسے کہ ہٹلر کا یہ خواب کہ برتر نسل (آریہ) دُنیا پر حکومت کرے، چینیوں کا صدیوں پرانا عقیدہ کہ وہ دُنیا کی ان تمام قوموں سے افضل ہیں جو دُنیا کے دوسرے خطوں میں آباد ہیں، گولڈ اسمتھ کا یہ دل خوش کن نخوت آمیز مفروضہ کہ جب وہ انگریزوں کو دیکھتا ہے تو اسے ان کے ''جلو میں بنی نوع انسان کے آقا نظر آتے ہیں''، جنوبی افریقہ والوں کا سیاہ فاموں پر اپنی برتری کا سیدھا سا عقیدہ جنہیں وہ معمولی انسانی حقوق سے بھی محروم رکھنے پر اڑے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی مسلمانوں نے بھی مذہب کی بنیاد پر ایسی برتری کا دعویٰ کیا ہے لیکن یہ اسلام کی روح سے کس حد تک توافق رکھتا ہے اس کی بحث ہم کسی دوسرے موقع پر کر چکے

Marfat.com

ہیں۔ مسلمانوں کا آئیڈیل قرآن کے مطابق یہ ہونا چاہیے کہ وہ اخلاقی سطح پر بہترین لوگ بن سکیں۔ یہاں ساری تاکید 'خیر' پر ہے، 'قوت' پر نہیں۔ فرد اور معاشرہ، دونوں کے لیے نیک اعمال کرنے کی ایک ہی دعوت دہرائی گئی ہے اور برائیوں سے پرہیز کرنے کو کہا گیا ہے:

ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروفِ وینھون عن المنکرِ و اولئك ھم المفلحون۔ (آلِ عمران،۳:۱۰٤)

(اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کرے، برائی سے اور وہی لوگ پہنچے اپنی مراد کو۔)

جیسا کہ میں اشارہ کر چکا ہوں، اس مثالی سماج کی جھلکیاں دوسری بہت سی آیات قرآنی میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں اور وہ اتنی زیادہ ہیں کہ یہاں ان کا نقل کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے یہ آیات اسلام کے تمام سماجی اور اخلاقی نصب العین کا احاطہ کرتی ہیں لیکن درج ذیل آیت سے اس کے وسیع تر خط وخال کا اندازہ ہو سکتا ہے:

قل تعالوا اتل ما حرم ربکم الاتشرکوا به شیئا وبالوالدین احسانا ولاتقتلوا اولادکم من املاق نحن نرزقکم و ایاھم ولاتقربوا الفواحش ماظھر منھا وما بطن ولاتقتلوا النفس التی حرم الله الا بالحق ذالك وصّکم به لعلکم تعقلون۔ (الانعام،٦:١٥١)

(تو کہہ دو تم کہ آؤ میں سنا دوں جو حرام کیا ہے تم پر تمہارے رب نے کہ شریک نہ کرو اس کے ساتھ کسی چیز کو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور مار نہ ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی سے۔ ہم رزق دیتے ہیں تم کو اور ان کو اور پاس نہ جاؤ بے حیائی کے کام کے جو ظاہر ہو اس میں سے اور

Marfat.com

جو پوشیدہ ہو اور مار نہ ڈالو اس جان کو جس کو حرام کیا اللہ نے مگر حق پر۔ تم کو یہ حکم کیا ہے تاکہ تم سمجھو۔)

اگر ہم ان آیات کا تجزیہ کریں تو انہیں بہت سی ایسی سماجی اور اخلاقی نیکیوں کا جامع پائیں گے جو زندگی کو صالح بنانے میں معاون ہوتی ہیں۔ خدا میں یقین رکھنا اور شرک سے انکار کرنا، اپنے والدین کے ساتھ احسان کرنا، اپنے بچوں کی مناسب نگہداشت کرنا، خصوصاً اولادکشی سے بچنا جو اس زمانے میں بہت عام تھی، ہر پست، فحش یا قبیح بات کو ترک کرنا خواہ وہ خلوت میں کی جائے یا جلوت میں، ہر طرح کے قتل سے اجتناب کرنا سوائے ان مواقع کے جہاں قانونی موجود ہو، یتیموں کے مال کی حفاظت اس وقت تک کرنا جب تک وہ بالغ نہ ہو جائیں، ہر طرح کے کاروبار اور بیوپار میں ایماندار ہونا خواہ وہ کاروبار اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کے ساتھ ہو یا اجنبیوں کے ساتھ، ایفائے عہد کرنا، خواہ وہ عہد بندوں سے ہو یا اللہ سے، اسے خدا کا سیدھا راستہ یعنی 'صراط مستقیم' کہا گیا ہے جس پر سب انسانوں کو مل کر چلنا چاہیے۔ ان آیات میں یہ کہیں نہیں ہے کہ ان مقاصد کی تکمیل کرانے کے لیے ایک اچھے اور منصفانہ نظام کی غرض سے کچھ خاص قسم کے ادارے قائم کیے جائیں بلکہ یہ آیات ان میں سے بعض مقاصد کی صرف تشریح تک خود کو محدود رکھتی ہیں۔

آپ دیکھیں گے کہ یہاں سارا زور ان 'واجبات' پر ہے جو دوسرے انسانوں کے سلسلے میں ہم کو بجا لانے ہیں۔ روایتی طور پر اسلامی فکر میں انسان کے فرائض کو تین خانوں میں بانٹا گیا ہے: (الف) حقوق النفس، (ب) حقوق اللہ، (ج) حقوق العباد۔ ایک مفہوم میں یہ وہ سب حقوق ہیں جو ہم پر اپنے لیے عاید ہوتے ہیں کیونکہ خدا کو کسی طرح کسی بھی کام سے جو ہم کرتے ہیں کسی طرح کا بھی فائدہ نہیں پہنچتا۔ دوسرے انسانوں کے لیے بھی ہم جو کچھ کریں یا ان کے جائز حقوق انہیں ادا کریں تو اس کا نفع بھی ایک طرح سے اپنے نفس ہی کے لیے ہوتا ہے، لیکن سب لوگوں کا دوسرے کے حقوق کو کھلے دل سے قبول کرنا اور اس کی خواہش کرنا ہی مہذب زندگی کی پہچان ہے اور سماجی رشتوں کی نفاست اور بھرم کو صرف یہی چیز قائم رکھ سکتی

Marfat.com

ہے۔ طاقت کے بل بوتے پر صحیح یا غلط حق کو منوا لینا نہیں بلکہ دوسروں کے حقوق ادا کرنے کے لیے دل میں پختہ عزم پیدا کرنا ضروری ہے۔ یہی وہ اصول ہیں جن کے بارے میں سمجھنا چاہیے کہ ان کا نفاذ عالمگیر سطح پر ہوتا ہے کیونکہ بصورتِ دیگر طاقتور انسان کمزور کے حقوق کو غصب کر سکتا ہے، اپنے فرائض ادا کرنے سے انکار کر سکتا ہے اور صرف اپنے نام نہاد ''حقوق'' پر اصرار کر سکتا ہے۔

اس طرح ہم آفاقی انسان کے تصور کو ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں جیسا کہ اسلام نے تقریباً چودہ سو سال پہلے اس کا نقشہ پیش کیا تھا۔ اس وقت سے اب تک اس پر بہت سے مفکرین بھی، جن میں بعض عہد حاضر کے بڑے رہنما بھی شامل ہیں، وقتاً فوقتاً زور دیتے آئے ہیں۔ اس لیے کہ آج جو طاقتیں دُنیا کی تشکیل کر رہی ہیں، وہ اس سمت میں اس طرح اشارہ کر رہی ہیں کہ اس کے سوا چارہ کار نہیں ہے۔

اسلام انسانوں میں ان صفات کا مطالبہ اس لیے کرتا ہے کیونکہ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ ان صفات کے بغیر نہ انسان اپنی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے اور نہ ان سے وہ خدا کے ساتھ اس کے مقاصد تکوین کو پورا کرنے میں اس کا شریکِ کار بن سکتا ہے۔ اس آفاقی انسان میں جس کا خاکہ ہم نے تاریخ میں کبھی واضح اور پوری شان و شوکت کے ساتھ اور کبھی دھندلا اور مبہم اور خیالی دیکھا ہے اور ان عام انسانوں میں جو دُنیا بھی میں غیر مطمئن اور غیر مکمل زندگی بسر کرتے پھر رہے ہیں، آخر کیا بنیادی فرق ہے؟ قرآن شریف کی سورۃ الفاتحہ کی عالمانہ تفسیر میں مولانا آزاد نے اس فرق کو ایک کہاوت میں سمیٹ لیا ہے جو بیک وقت مذہبی بھی ہے اور آفاقی بھی۔

الفاتحہ ایک دُعا کی شکل میں ہے جو بندہ اپنے رب سے کرتا ہے۔ اس میں وہ اپنے دل کی ساری تمنائیں نکال کر رکھ دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ کس طرح کا انسان بننا چاہتا ہے۔ وہ سب لوگوں کی بھلائی کے لیے دُعا کرتا ہے خواہ ان کا کچھ بھی مذہب یا رنگ و نسل یا سماجی رتبہ ہو، اسے یہ فکر ہے کہ وہ صراطِ مستقیم پر چل سکے جو کوئی 'خاص' اور 'محدود' راستہ نہیں ہے بلکہ ان

Marfat.com

سب کا راستہ ہے جن پر اللہ نے اپنی نعمتیں نازل کیں۔ وہ دُعا کرتا ہے کہ ان سب کے راستے سے بچا رہے جن پر ان کی بداعمالیوں اور ہدایت پر چلنے سے انکار کے سبب خدا کا غضب نازل ہوا۔ میں پہلے یہاں شروع سے سورۂ فاتحہ درج کروں گا:

الحمد الله رب العالمین۔ الرحمن الرحیم۔ مالك یوم الدین۔ ایاك نعبدو و ایاك نستعین۔ اهدنا الصراط المستقیم۔ صراط الذین انعمت علیهم۔ غیر المغضوب علیهم و لاالضالین۔ (۱:۱-۷)

(ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے۔ جو رحمت والا ہے اور جس کی رحمت تمام مخلوقات کو اپنی بخششوں سے مالا مال کر رہی ہے۔ جو اس دن کا مالک ہے جس دن کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصے میں آئے گا۔ (خدایا!) ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور صرف تو ہی ہے جس سے (اپنی ساری احتیاجوں میں) مدد مانگتے ہیں۔ (خدایا!) ہم پر (سعادت کی) سیدھی راہ کھول دے، وہ راہ جو ان لوگوں کی راہ ہوئی جن پر تو نے انعام کیا۔ ان کی نہیں جو پھٹکارے گئے اور نہ اُن کی جو راہ سے بھٹک گئے۔) (ترجمان القرآن: جلد ا، ص ۲۲۶)

یہاں ایک شخص خدا کی حمد بیان کر رہا ہے۔ مگر وہ رب جس کی وہ مدح کر رہا ہے کسی خاص قوم یا قبیلے یا مذہبی جماعت کا رب نہیں ہے بلکہ ساری دُنیا کا رب ہے۔ 'رب العالمین' ہے جو سارے بنی نوع انسان کا پالنے والا اور ان پر رحم کرنے والا ہے۔ اس لیے تمام نوع انسانی کے لیے یکساں طور پر پروردگاری اور رحمت رکھتا ہے، پھر وہ اسے اس کی صفتوں کے ساتھ پکارنا چاہتا ہے، لیکن اس کی تمام صفتوں میں سے صرف رحمت اور عدالت ہی کی صفتیں اُسے یاد آتی ہیں۔ گویا خدا کی ہستی کی نمود اس کے لیے سرتاسر رحمت و عدالت کی نمود ہے اور جو کچھ بھی اس

Marfat.com

کی نسبت جانتا ہے وہ رحمت و عدالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پھر وہ اپنا سرِ نیاز جھکاتا اور اس کی عبودیت کا اقرار کرتا ہے، وہ کہتا ہے، صرف تیری ہی ایک ذات ہے جس کے آگے بندگی و نیاز کا سر جھک سکتا ہے اور صرف تو ہی ہے جو ہماری ساری درماندگیوں اور احتیاجوں میں مددگاری کا سہارا ہے۔ وہ اپنی عبادت اور استعانت دونوں کو صرف ایک ہی ذات سے وابستہ کر دیتا ہے اور اس طرح دُنیا کی ساری قوتوں اور ہر طرح کی انسانی فرماں روائیوں سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ اب کسی چوکھٹ پر اس کا سر نہیں جھک سکتا۔ اب کسی قوت سے وہ ہراساں نہیں ہو سکتا۔ اب کسی کے آگے اس کا دستِ طلب دراز نہیں ہو سکتا۔

''پھر وہ خدا سے سیدھی راہ چلنے کی توفیق طلب کرتا ہے۔ یہی ایک مدعا ہے جس سے زبان احتیاج آشنا ہوتی ہے لیکن کون سی سیدھی راہ؟ کسی خاص نسل کی سیدھی راہ؟ کسی خاص قوم کی سیدھی راہ؟ کسی خاص مذہبی طبقے کی سیدھی راہ؟ نہیں وہ راہ جو دُنیا کے تمام مذہبی رہنماؤں اور تمام راست باز انسانوں کی متفقہ راہ ہے خواہ کسی عہد اور کسی قوم میں ہوئے ہیں۔ اسی طرح وہ محرومی اور گمراہی کی راہوں سے پناہ مانگتا ہے لیکن یہاں بھی کسی خاص نسل و قوم یا کسی خاص مذہبی گروہ کا ذکر نہیں کرتا بلکہ ان راہوں سے بچنا چاہتا ہے جو دُنیا کے تمام محروم اور گمراہ انسانوں کی راہیں رہ چکی ہیں۔ گویا جس بات کا طلب گار ہے وہ بھی نوعِ انسان کی عالمگیر اچھائی ہے اور جس بات سے پناہ مانگتا ہے وہ بھی نوعِ انسان کی عالمگیر برائی ہے۔'' (ترجمان القرآن: جلد ۱، ص ۲۲۳)

تیرہ سو سال کے بعد ہمارے عہد کے ایک عظیم باشعور انسان دوست دانش ور 'لیوس ممفورڈ' نے جس کا میں حوالہ دے چکا ہوں، ایک 'متوازن انسان' کا خاکہ کھینچا ہے۔ یہ لفظ وہ کم و بیش انہیں معنوں میں استعمال کرتا ہے جسے میں 'آفاقی انسان' کہتا ہوں۔ میں اس کا اقتباس

Marfat.com

ب، اسلام

بھی کہ وہ

بے شبہ جو ترقی

کی ہے اس کے باوجود اسلام نے جن بنیادی ... پر زور دیا ہے اس ... ج میں ہم کوئی قابل لحاظ پیش رفت نہیں کر سکے ہیں۔

''ہم متوازن انسان کو کس طرح ... کریں گے جسے ایک مثالی نمونہ سمجھا جائے۔ وہ کسی ایک کلچر کا نہیں ہوتا اور نہ زمین کے کسی علاقے کی نسبت سے پہچانا جاتا ہے۔ نہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے اپنے مذہب یا سائنس کے ذریعے حق کی واحد کنجی اس کے ہاتھ لگ گئی ہے، نہ وہ اپنی نسل یا قومیت پر فخر کرتا ہے گویا پیدائش کے اتفاقی واقعات بعض صورتوں میں خصوصاً قابلِ تعریف ہو سکتے ہیں۔ یہ پرانے قبائلی افتخار کی جمہوری پیروڈی ہے۔ اس کی جڑیں اس کے اپنے علاقے، خاندان اور پڑوس میں گہری ہوں گی اور وہ گہرائی بجائے خود دوسرے انسانوں سے مضبوط رشتے کی ضمانت ہوگی۔ مگر اس کی فطرت کا ایک حصہ مسلسل وسیع تر دُنیا سے رابطہ قائم رکھتا ہے۔ اس کے مذہب کے ذریعے بھی اور سیاست کے ذریعے بھی اور وہ اس کے تقاضوں اور اثرات کو قبول کرنے کے لیے بھی کھلا رکھتا ہے۔''

Marfat.com

اسلام

امن و آشتی کا مذہب

مصنف: خواجہ غلام السیدین

مترجم: ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

Institute of Islamic Culture
ادارہ ثقافت اسلامیہ
Lahore - Pakistan

297.01
غ 543 ا
124488

Marfat.com